قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

جولائی ۱۹۵۸ع

شائع کردہ :-
ادارۂ طلوع اسلام
B—25 گلبرگ کالونی لاہور
قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان میں
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام
25/B گلبرگ کالونی — لاہور

جلد ۱۱ — جولائی ۱۹۵۸ء — نمبر ۷

فہرست مضامین

لمعات		۲
من و یزداں	(محترم پرویز صاحب)	۱۷
دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں		۴۱
حقائق و عبر		۵۹
مجلس اقبال		۶۵
اسلام کی سرگذشت		۷۲
نقد و نظر		۷۷

اتحاد پریس لاہور

لمعات

الیکشن کی تیاریاں

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس
کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں
گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے۔

(سینٹ پال۔ رومیوں کے نام خط)

عصرِ حاضر کی ابلیسی سیاست کا امام، اطالیہ کا مشہور مفکر، میکیاوٗلی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے فلسفۂ سیاست کا ملخص یہ ہے کہ اصل اہمیت مقصد کو حاصل ہے۔ ذرائع کو نہیں۔ حصولِ مقصد کے لئے جو ذرائع بھی اختیار کئے جائیں سب جائز ہیں۔ اس اصول کے پیشِ نظر، جھوٹ، فریب، دغابازی، دھوکا دہی، معاہدہ شکنی، غرضیکہ ہر حربہ، جو حصولِ مقصد کے لئے مفید ہو، نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اس فلسفۂ سیاست نے دنیا کو جس طرح درندوں کا بھٹ بنا دیا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اور تو اور، خود وہ قومیں جو اس سیاست کی امام سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی سبعیت و بربریت کے ہاتھوں اس درجہ نالاں ہیں کہ ان کی چیخ و پکار کی آواز ہر ایوانِ مملکت سے سنائی دیتی ہے۔

اس سیاست کی تباہ کاریاں ویسے ہی کچھ کم نہیں ہوتیں۔ لیکن جب یہ پولیٹکل لیڈروں کے بجائے مذہبی اقتدار پرستوں کے ہاتھ کا کھلونا بنتی ہے تو اس کی تباہ کاریاں اور دہشت سامانیاں اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے ہاں یہ سیاست مذہبی تقدس کی نقاب کی اوٹ میں، "خدا اور رسول" کے نام کی مالا جپتی اور شریعتِ حقہ کی عظمت و اقتدار کے نعرے بلند کرتی آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی سے یہ سیاست (بلا نقاب اور نقاب پوش۔ دونوں شکلوں میں) پاکستان میں فروغ پا رہی ہے۔ بلا نقاب، سیاسی راہنماؤں کے ایوانوں میں اور نقاب پوش، مذہب کی سب سے بڑی اجارہ دار جماعت اسلامی کے تسبیح خانوں

ملیں۔ قارئین کو معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کے منتخب افراد کا ایک کثیر حصہ اس جماعت سے الگ ہو چکا ہے۔ ان "معترلین" نے امیر جماعت کے خلاف جو الزامات عائد کئے تھے ان میں بنیادی الزام یہ تھا کہ جب تک معاملہ محض وعظ و تبلیغ تک رہا، مودودی صاحب اسلام کے زریں اصول پیش کرتے چلے گئے۔ لیکن جب ان اصولوں پر عمل کرنے کا وقت آیا، تو انھوں نے انھیں بالائے طاق رکھ دیا اور حصول اقتدار کے لئے ہر قسم کے حربوں کو جائز قرار دیدیا۔ اور دھڑلے سے کہہ دیا کہ عملی دنیا میں پہنچ کر دین کے اصولوں میں لچک پیدا نہ کرنا حکمت عملی ہی نہیں، حکمت دین کے بھی خلاف ہے۔ (تفصیل ان امور کی طلوع اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۶۰ء صفحہ ۳۳-۴۲ میں گزر چکی ہے)

مودودی صاحب کی بیباک جرأت

جو سیاست مذہبی نقاب کی آڑ میں آگے بڑھتی ہے، اس کا سب سے بڑا الم انگیز اور جگر سوز اقدام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فریب کارانہ روش کی تائید میں، مقدس سے مقدس اور عظیم سے عظیم ہستیوں کو اپنے حق میں بطور گواہ پیش کرنے سے بھی نہیں شرماتی۔ چنانچہ جب مودودی صاحب کی اس روش پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے جھٹ سے فرما دیا کہ میں نے یہ کونسا انوکھا کام کیا ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ پناہ بخدا) خود نبی اکرمؐ نے اسلامی نظام کے جو اصول پیش فرمائے تھے جب عملاً اس نظام کو قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو حضورؐ نے ان اصولوں میں لچک پیدا کی۔ اس کی مثال میں مودودی صاحب نے کہا کہ

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دیکر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن
>
> جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ امام قریش میں سے ہوں۔
>
> ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

مودودی صاحب سے الگ ہونے والوں نے ان کے اس نظریہ کے متعلق لکھا کہ

> غور فرمائیے۔ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبی نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامت دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور

جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے، جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جن اصول میں ضروری خیال کرے استثنا پیدا کرلے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کردے (جیسا کہ بعینہٖ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حق خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامتِ دین کی جد و جہد، اور ان طالع آزما سیاستدانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور اپنی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جب مودودی صاحب کے بعض معتقدین ان اعتراضات سے گھبرائے تو مودودی صاحب نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ تمہارا ایمان بڑا کمزور ہے جو "اقامت دین" کی منزل اول ہی میں گھبرا اٹھے ہو۔ یہ تو وہ وادی ہے جس میں اصولوں میں لچک پیدا کرنا تو ایک طرف جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ (ایک سوال کے جواب میں) ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء میں ارشاد فرماتے ہیں۔

جھوٹ اور فریب سب جائز

راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

چونکہ ہماری حدیثوں کے مجموعوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس لئے ان میں سے ہر شخص کو اپنی تائید میں روایات مل جاتی ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا "اصول" بیان فرمانے کے بعد مودودی صاحب نے "جھوٹ کے وجوب" میں دو تین حدیثیں بھی نقل کردی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ

اسماء بنت یزید نبی اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اس کو راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ لکھا ہے

پناہ بخدا!

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے امیر کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟

حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔

(بخاری باب الکذب فی الحرب باب لفتک باہل الحرب)

اس کے بعد انہوں نے ائمۂ کرام کے فتاویٰ سے بھی جھوٹ کے جواز اور وجوب کو ثابت کر دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ علامہ نووی ریاض الصالحین میں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ اصول بیان کرتے ہیں۔

ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے۔ لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے۔ پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو کہ اس کا حاصل کرنا مباح ہے تو اس کے لئے جھوٹ بھی مباح ہے۔ اور اگر اس کا حصول واجب ہو تو اس کے لئے جھوٹ بھی واجب ہے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو یہاں بھی وہی قاعدہ کارفرما نظر آتا ہے کہ سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کرنے کی ایک اخلاقی قیمت ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز کا نقصان ہو رہا ہو اس سے نسبتاً کم قیمت کا نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں گوارا کرنا چاہیئے۔

آپ غور فرمائیے کہ مودودی صاحب کی پیش کردہ "شریعت" اور میکیاولی سیاست میں کچھ بھی فرق ہے؟ فرق ہے تو اتنا کہ میکیاولی سیاست پر عامل (سیاسی لیڈر) اپنے جھوٹ۔ فریب۔ دغابازی کو کبھی نظریہ بیان نہیں کرے گا۔ اگر ان الزامات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا تو وہ ان سے انکار کر دے گا اور یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کہ وہ اس قسم کی حرکات سے بہت بلند ہے۔ یعنی وہ جھوٹ۔ فریب۔ دھوکا دہی کو عیوب شمار کرے گا۔ اور ان کے ارتکاب پر کبھی فخر نہیں کرے گا۔ لیکن مودودی شریعت' پر عامل انسان اپنے جھوٹ پر فخر کرے گا۔ وہ اسے نیکی اور ثواب کا کام تصور کرے گا اور دوسرے کو دھوکا دے کر خوش ہوگا کہ وہ خدا کے حضور سرخرو جائے گا۔ اس لئے کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ ایسا کرنا خدا کا حکم اور (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ نقل کفر کفر نباشد) رسول اللہ کی سنت ہے۔

الیکشن کی خاطر

ظاہر ہے کہ یہ میکیاولی شریعت، الیکشن کی پیش بندی ہے۔ مودودی صاحب نے پہلے فتویٰ دیا تھا کہ اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنا، شریعت اسلامی کے بالکل خلاف ہے۔ اب آنے والے انتخابات میں ان کی جماعت کے لوگ بطور امیدوار کھڑے ہو رہے ہیں۔ اس پر اعتراض ہوتا تھا کہ صالحین کی یہ جماعت، اس قسم کی خلاف شریعت حرکت کی مرتکب کیوں ہو رہی ہے؟ اس کا جواب پہلے سے مرتب کر لیا گیا کہ عملی سیاست میں آ کر نظری اصولوں میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یعنی جو کچھ نظری طور پر حرام ہو، وہ عملی طور پر حلال و طیب بن جاتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ الیکشن لڑنے کے لئے ان حضرات نے بھی جھوٹ۔ فریب۔ دغابازی۔ جعل سازی سے کام لینا ہے۔ اس کے لئے بھی پہلے ہی زمین تیار کر لی گئی کہ ایک بڑے مقصد کے حصول کے لئے چھوٹی چھوٹی اخلاقی اقدار کو پامال کیا جا سکتا ہے۔

بلکہ ایسا کرنا چاہیئے۔ چونکہ اقامت دین (یعنی الیکشن میں کامیابی) بلند ترین مقصد ہے۔ اس لئے اس میں کامیابی کے لئے صداقت، راستبازی، دیانت، امانت جیسی معمولی اقدار کا نقصان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہ خدا اور رسول کا حکم اور شریعت کا مطالبہ ہے جسے ہر مومن صالح کو پورا کرنا چاہیئے۔

تباہی کا جہنم

یہ تو رہا اس جماعت کا مقصد۔ لیکن آپ سوچئے کہ جھوٹ اور فریب کا لائسنس دینے والی یہ شریعت، قوم کو تباہیوں اور بربادیوں کے کس جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ

(۱) ملک میں اخلاقی اقدار کی پابندی پہلے ہی کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ابھی تک معاشرہ میں اتنی حیا (یا جھجک) باقی ہے کہ جھوٹا اور فریب کار اپنے اس کردار کو معاشرہ کے سامنے فخریہ پیش نہیں کرتا۔ لیکن جب ان سے کہہ دیا جائے کہ اچھے مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ، فریب، دغابازی، سب جائز بلکہ واجب ہو جاتے ہیں تو سوچئے کہ نفسیاتی طور پر اس کا قوم پر کیا اثر پڑے گا؟

(۲) جماعت اسلامی گذشتہ دس گیارہ سال سے مسلسل، سیاسی لیڈروں کو کوستی چلی آ رہی ہے کہ یہ جھوٹے، فریب کار دغاباز ہیں۔ یہ وعدوں کا پاس اور معاہدوں کا احترام نہیں کرتے۔ یہ اپنے مخالفین کو الگ کرنے میں ہر حربہ استعمال کر لیتے ہیں۔ انھوں نے حکومت کی مسندیں اپنے گروہ کے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ یہ سب اقربا نوازی اور اعزہ پروری ہے۔

یہ اور اس قسم کے الزامات کا تانتا ہے جو جماعت اسلامی کی طرف سے بندھا رہتا ہے۔ اب اگر یہ سیاسی لیڈر کہیں کہ حضرت! ہم یہ سب کچھ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کے لئے کرتے ہیں۔ پاکستان کا تحفظ ہمارے نزدیک بلند ترین مقصد ہے جس کے حصول کے لئے اس سے نسبتاً کم قیمت کی تمام اخلاقی اقدار کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ "خدا اور رسول" کے حکم کے عین مطابق ہے۔ ہم اگر جھوٹ بولتے ہیں تو اس حدیث کے مطابق بولتے ہیں جسے مودودی صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ ہم اگر کسی کو دھوکے سے قتل بھی کرا دیتے ہیں تو یہ کعب بن اشرف کے واقعۂ قتل کے اتباع میں کرتے ہیں۔ اگر ہم حکومت کی مسندوں کو اپنے گروہ، برادری، حلقہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے وہی مصلحت ہے جس مصلحت کے پیش نظر امامت کو قریش کے اندر محدود کر دیا گیا تھا۔

اگر یہ سیاسی لیڈر یہ کہیں تو۔ فرمایئے! آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ غالباً یہی جواب ہوگا کہ نہیں! شریعت کی یہ اجازت صالحین کی جماعت تک محدود ہے۔ اس سے باہر جو جھوٹ بولے یا فریب دے، وہ دنیا کا مجرم ہوگا۔ ہمارا جھوٹ، شرعی جھوٹ ہے۔ تمھارا جھوٹ غیر شرعی۔ اس لئے یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

(۳) اور آگے بڑھئے۔ ہم نے دنیا کو بتایا ہے کہ ہمارا دستور و آئین۔ بلکہ قوانین و ضوابط، کتاب و سنت پر مبنی ہوں گے۔ اب جس وقت دنیا سنے گی کہ ان کی "کتاب و سنت" کا ارشاد یہ ہے کہ اچھے مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ۔ فریب۔ دغابازی عہد فراموشی۔ معاہدہ شکنی۔ سب جائز بلکہ واجب ہو جاتے ہیں، تو دنیا کی کونسی قوم آپ پر اعتماد کرے گی اور کس کے دل میں

آپ کا احترام باقی رہے گا؟ دنیا کی بدترین سے بدترین قوم بھی کبھی یہ نہیں کہتی کہ ہمارے ہاں جھوٹ اور فریب جائز ہیں۔ دنیا کا نظام اور افراد و اقوام کا باہمی ربط و ضبط اس بنیاد پر قائم ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں جھوٹ اور فریب کو کوئی جائز نہیں قرار دیتا۔ لیکن جب دنیا کو معلوم ہوگا کہ ایک ایسی قوم بھی ہے جن کے ہاں جھوٹ اور فریب کا جواز ہی نہیں وجوب، ان کی شریعت کا تقاضا ہے تو کون شریف انسان آپ کو اپنے پاس بیٹھنے دے گا؟ اب تک تو مسلمانوں کو مہذب سوسائٹیز میں بدنام کرنے کے لئے لاتعداد حرم" اور غلام اور لونڈیوں کی داستانیں (جن کے جواز کا فتویٰ مودودی صاحب پہلے دے چکے ہیں)۔ زبان زدِ خلائق تھیں۔ اب ان میں اس کا بھی اضافہ ہو جائے گا کہ ان کے ہاں جھوٹ اور فریب کو بھی ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔

آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور سوچئے کہ یہ حضرات اپنے جھوٹ اور فریب کے جواز کے لئے قوم کو کس جہنم میں دھکیل رہے ہیں!

(۲) اس کے ساتھ یہ بھی سوچئے کہ اگر (خدانکردہ) کل کو زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آگئی تو یہ صالحین "خدا اور رسول" کے نام اور شریعت حقہ کی آڑ میں کیا کچھ نہیں کر گذریں گے؟ جن لوگوں کے نزدیک، جھوٹ بولنا۔ دھوکا دینا۔ فریب سے قتل کرا دینا۔ اختیارات و اقتدارات کو اپنے حلقہ میں محدود کر لینا۔ نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوں، ان کے ہاتھوں کس کی جان، مال۔ عزت۔ آبرو محفوظ ہوگی۔ پھر جب اسے بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ ان حضرات کے نزدیک مرتد کی سزا قتل ہے اور مرتد سے مراد ہر وہ شخص ہے جو ان کا ہم عقیدہ نہ ہو، تو ان کے ہاتھوں انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ طلوعِ اسلام گذشتہ دس برس سے ملک کو ان خطرات سے آگاہ کرتا چلا آرہا ہے۔ اُس وقت بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ خدشات محض مفروضات پر مبنی ہیں۔ لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ جو کچھ مودودی صاحب نے اب کھلے بندوں کہہ دیا ہے اس کے پیشِ نظر کونسا خدشہ ہے جو حقیقی نہیں بن جاتا؟

جہادِ کشمیر کا فتویٰ

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جہادِ کشمیر کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ چونکہ حکومت پاکستان اور بھارت کا باہمی معاہدہ صلح ہے اس لئے جنگِ کشمیر میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ مودودی صاحب نے اب شریعت کا یہ فتویٰ پیش کیا ہے کہ بڑے مقصد کے حصول کے لئے اس سے کم قیمت کی اخلاقی اقدار کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ (اس اصول کے مطابق) اگر حکومت پاکستان استحکامِ پاکستان اور حصولِ کشمیر کے بلند ترین مقصد کی خاطر، احترامِ معاہدہ کی کم قیمت کی اخلاقی قدر کو توڑ دیتی تو کیا اس کا یہ اقدام عین شریعت کے مطابق نہ ہوتا؟ سوال یہ ہے کہ جو حدیثیں اور فتاوے مودودی صاحب (اپنے الیکشن کی خاطر) اب پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان حدیثوں اور فتووں کو اُس وقت کیوں چھپائے رکھا اور اپنا فتویٰ ان کے خلاف کیوں دیا؟ کیا ان کا یہ اقدام پاکستان کے خلاف غداری اور شریعت حقہ سے دغابازی نہیں ہے؟

اگر کہا جائے کہ نہیں۔ معاہدہ کا احترام تحفظِ پاکستان یا حصولِ کشمیر کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ دو پیشِ نظر امور میں سے کونسا زیادہ قیمتی ہے؟ کیا اس کا فیصلہ بھی جماعتِ اسلامی کے ڈکٹیٹر کی مرضی پر موقوف ہوگا؟ اس جماعت کی طرف سے اس کا جواب یقیناً اثبات میں ملے گا۔

قرآن سے سند مودودی صاحب اپنے مسلک کی تائید میں قرآن کو بھی کھینچ لائے ہیں۔ اور اس سے (بزعمِ خویش) دو مثالیں پیش کی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

(۱) اسلام میں توحید کے اقرار کی جیسی کچھ اہمیت ہے کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں۔ یہ حق پرستی کا اولیں تقاضا اور ہر مومن سے اس کا پہلا مطالبہ ہے۔ نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں قطعاً کسی لچک کی گنجائش نہ ہونی چاہیئے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ چاہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جائے اور خواہ اس کی بوٹیاں کاٹ ڈالی جائیں وہ توحید کے اقرار و اعلان سے ہرگز نہ پھرے۔ مگر قرآن ایسے حالات میں جبکہ ایک شخص کو ظالموں سے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ یا اسے ناقابلِ برداشت اذیت دی جائے کلمہ کفر کہہ کر بچ جانے کی اجازت دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دل میں عقیدہ توحید پر قائم رہے (مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ ..... ۱۶/۱۰۶) یہ چاہے عزیمت کا مقام نہ ہو مگر رخصت کا مقام ضرور ہے۔ اور یہ رخصت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمائی ہے۔ .....

(۲) اسلام میں شراب۔ خنزیر۔ مردار۔ خون اور مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ کو اسی طرح حرام کیا گیا ہے۔ جس طرح زنا۔ چوری۔ ڈاکے اور قتل کو حرام کیا گیا ہے۔ اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جان بچانے کیلئے پہلی قسم کی حرمتوں کیلئے شریعت خود رخصت کا دروازہ کھول دیتی ہے کیونکہ ان حرمتوں کی قیمت جان سے کم ہے[1]۔

آپ غور کیجئے کہ جس بات کو ثابت کرنے کے لئے مودودی صاحب نے قرآن کی ان مثالوں کو پیش کیا ہے، انھیں اس بات سے دور کا بھی واسطہ ہے؟ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ

---

[1] مودودی صاحب نے اس مقام پر اضطراری حالت میں زنا کو جائز قرار نہیں دیا حالانکہ اس سے پہلے یہ اضطراری حالت میں اسے جائز قرار دے چکے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ انہوں نے لکھا تھا کہ اگر کوئی جہاز ٹوٹ جائے اور اس کے ایک تختہ پر ایک مرد اور ایک عورت تیرتے تیرتے کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جائیں جہاں کوئی نکاح خواں اور گواہ نہ ہوں تو اس اضطراری حالت میں وہ بلا نکاح جنسی اختلاط کر سکتے ہیں (اس وقت تک جب تک وہ پھر کسی بستی کے قریب نہ پہنچ جائیں)۔

معلوم نہیں کہ مودودی صاحب اس اضطراری حالت کو بھول گئے یا اب کسی نئی مصلحت نے سابقہ رخصت کو منسوخ کر دیا؟

(۱) جو جماعت دین کی اقامت کے لئے اٹھے اس کے لئے جائز ہے کہ جن اصولوں کو وہ اشاعتی اور تبلیغی دور میں پیش کرتی رہی ہے، عمل کے وقت ان سے منحرف ہو جائے۔ (مثلاً اشاعتی دور میں وہ مساواتِ انسانی کی تبلیغ کرے اور عمل کے وقت حکومت کو ایک خاص قبیلہ (قریش) میں محدود کر دے۔) یا

(۲) جس مقصد کا حصول جھوٹ کے بغیر ناممکن ہو اس کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔

اور قرآن سے جو مثالیں انھوں نے پیش کی ہیں ان میں صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ اگر کسی کی جان خطرے میں ہو تو اسے اجازت ہے کہ وہ جان بچانے کی خاطر، کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دے یا حرام شے کھالے۔ آپ سوچئے کہ کیا جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر کہہ دینا اور دوسرے کی جان لینے کے لئے جھوٹ اور فریب سے کام لینا ایک ہی بات ہے؟ کیا مرنے سے بچنے کی خاطر مردہ جانور کا گوشت کھا لینا اور عملاً نظامِ اسلامی قائم کرنے کے وقت ان اصولوں کو خیرباد کہہ دینا جن کی دورِ اول میں اشاعت کی جاتی تھی، ایک ہی چیز ہے؟ سوچئے کہ وہ کونسی اضطراری حالت ہو سکتی ہے جو انسان کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ دوسرے کو جھوٹ اور فریب سے قتل کر دے یا اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اپنے سابقہ اصولوں کو پس پشت ڈال دے؟ آپ کہہ دیں گے کہ انسان کو "مصلحت" کا تقاضا ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن کیا "مصلحت" اور "اضطرار" میں کوئی فرق نہیں؟ اضطرار کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو انسان کی جان نہ بچ سکے۔ یعنی اس کے سامنے جان بچانے کی کوئی متبادل شکل ہی نہ ہو۔ اور مصلحت کے معنی یہ ہیں کہ دو متبادل شکلوں میں سے ایک شکل حصولِ مقصد کے لئے زیادہ کارگر ہو۔ قرآن نے اضطراری حالت میں جان بچانے کے لئے جو رخصت دی ہے اس سے یہ مستنبط کرنا کہ وہ حصولِ مقصد کے لئے دروغ گوئی اور فریب کاری یا عملی میدان میں آنے کے وقت اپنے سابقہ اصولوں سے انحراف کی اجازت دیتا ہے، قرآن کو اپنی خواہشات کی لونڈی بنانے کی بدترین مثال ہے۔ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّ يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۔ وَ مَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (۲/۲۶)

احادیث سے سند

کہا جا سکتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک صرف قرآن ہی سند نہیں۔ احادیث بھی سند ہیں۔ لہٰذا جن باتوں کا حکم احادیث سے ملتا ہو وہ ان سے انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔ ایسے امور میں مودودی صاحب کو موردِ الزام قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ احادیث پر اعتراض کرتے ہیں۔ بلکہ مودودی صاحب کے الفاظ میں گندگی کے یہ چھینٹے مودودی صاحب کے دامن پر نہیں بلکہ (ربنا وعبدا) خود "رسول اللہ" کے دامنِ پاک پر پھینکے جاتے ہیں۔

احادیث کے بارے میں مودودی صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے احادیث کے مجموعوں (حتیٰ کہ بخاری اور مسلم) میں بھی ہر حدیث اس قابل نہیں کہ اسے بجنسہٖ تسلیم کر لیا جائے۔ جامعین احادیث نے روایت کی رو سے احادیث کی پرکھ کی تھی۔ ہمیں درایت کی رو سے انہیں جانچنا چاہیئے۔ اور جو اس اصول پر ٹھیک نہ اتریں انہیں ضعیف یا وضعی قرار دے دینا چاہیئے۔

چنانچہ جب حکیم حیدر زمان صدیقی (مرحوم) نے زمین کو بٹائی پر دینے کے خلاف کچھ احادیث پیش کی تھیں تو مودودی صاحب نے انھیں یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ یہ احادیث ضعیف ہیں اور ان کے مقابلہ میں ان کی (مودودی صاحب کی) پیش کردہ احادیث صحیح ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مودودی صاحب کا عقیدہ یہ نہیں کہ ہمارے احادیث کے مجموعوں میں جس قدر حدیثیں موجود ہیں سب سچی ہیں۔ وہ احادیث پر تنقید کو جائز (بلکہ ضروری) قرار دیتے ہیں۔ اور اس باب میں "مزاج شناس رسول" کی بصیرت کو کسوٹی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مودودی صاحب نے جو احادیث اپنی تائید میں پیش کی ہیں ان کا احادیث کے مجموعوں میں موجود ہونا مودودی صاحب کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ انھیں صحیح تسلیم کریں۔ انھوں نے انھیں اس لئے صحیح تسلیم کیا ہے کہ یہ ان کے مسلک و روش گوئی دفریب دہی کی تائید کرتی ہیں۔ ہمارے احادیث کے مجموعوں کا یہی وہ نقص ہے جسے طلوع اسلام ایک عرصہ سے سامنے لاکر ارباب بصیرت کی توجہ اس طرف منعطف کرا رہا ہے کہ ان مجموعوں میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جن سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ داغدار ہو جاتی ہے اور جن سے ہر مطلب پرست اپنے مسلک کی تائید حاصل کر لیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان مجموعوں کی چھان بین کر کے ایسی احادیث کو الگ کر دیا جائے۔ اس تنقید کے لئے معیار قرآن کریم قرار دیا جائے۔ جو حدیث اس کے خلاف جائے اسے وضعی ٹھہرا کر کتب احادیث سے نکال دیا جائے۔ یہ ہے طلوع اسلام کا وہ جرم جس کی بنا پر اسے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ اگر ہمارے احادیث کے مجموعوں سے اس قسم کی روایات نکال دی جائیں تو مفاد پرست لوگوں کو اپنے مقاصد کی تائید کہیں سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کی تجویز کی مخالفت ضروری ہے۔ آپ اسی ایک مثال پر غور کیجئے۔ مودودی صاحب کو الیکشن کے لئے اپنے سابقہ اصولوں سے انحراف اور جھوٹ اور فریب کی ضرورت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کے لئے دینِ حقہ سے کبھی بھی اجازت و تائید نہیں مل سکتی۔ لیکن انھیں روایات ایسی مل سکتی ہیں جن سے ان باتوں کا جواز ثابت ہو جائے لہٰذا یہ چیز ان کے حق میں جاتی ہے کہ ان مجموعوں میں اس قسم کی روایات موجود رہیں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ احادیث پر تنقید کے حامی ہونے کے باوجود طلوع اسلام کی تجویز کے شدید مخالف ہیں کہ ان مجموعوں سے اس قسم کی حدیثیں نکال دی جائیں۔ اس قسم کے لوگوں کا تو کاروبار ہی اس قسم کی وضعی حدیثوں کے سہارے چلتا ہے۔ ان کی مصلحت ساری ہے کہ وہ ان احادیث کو ان مجموعوں سے نکال دیں! وہ ان روایات کو علیٰ حالہ بھی رکھیں گے اور ان کے ساتھ ان پر تنقید کا حق بھی محفوظ رکھیں گے۔ تاکہ جب جی چاہا اپنے مطلب کی روایت آگے بڑھا دی اور جب فریقِ مقابل نے کوئی روایت ان کے خلاف پیش کی تو اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ضعیف ہے۔ مذہبی کاروبار کرنے والوں کے یہ تجارتی راز (Trade Secrets) ہیں جنہیں عوام بیچارے کیا سمجھ سکتے ہیں۔

ریاض الصالحین

باقی رہا ریاض الصالحین کا اقتباس (جو ہمارے دور کے صالحین کی منشا کے عین مطابق ہے) تو اس پر علم و دیانت جس قدر ماتم کرے کم ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ "جس مقصد کا حصول جھوٹ

سکے بغیر ممکن ہو اس کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے۔" ان سے کوئی پوچھے کہ وہ کون پاگل ہے جو کسی ایسی بات کے لئے جھوٹ بولے گا جو بغیر جھوٹ بولے حاصل ہو سکتی ہو! آپ کسی شخص سے کہئے کہ تو نے جھوٹ کیوں بولا ہے؟ وہ جھٹ سے جواب میں کہدے گا کہ "مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا"! یعنی بلا ضرورت کوئی صاحبِ ہوش جھوٹ نہیں بولتا۔ جھوٹ بولا ہی وہیں جاتا ہے جہاں جھوٹ کے بغیر مطلب حاصل نہ ہوتا ہو۔

اس کے بعد (ریاض الصالحین کی رُو سے جھوٹ کے "ثواب" کے درجے آتے ہیں۔ یعنی

(۱) اگر مقصد ایسا ہو جس کا حاصل کرنا مباح ہو تو اس کے لئے جھوٹ بولنا مباح ہوگا۔

(۲) اگر مقصد ایسا ہو جس کا حاصل کرنا واجب ہے تو اس کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔

اس کلیہ کے مطابق اگر مقصد ایسا ہو جس کا حاصل کرنا سنت ہے تو اس کے لئے جھوٹ بولنا (معاذ اللہ) سنت ہوگا۔ اگر اس کا حصول فرض ہے تو جھوٹ بولنا فرض قرار پا جائے گا۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور شرم سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑی جا رہی ہیں کہ دنیا کیا کہے گی کہ ان کے مذہبی لٹریچر میں کس کس قسم کی چیزیں موجود ہیں! ہم دنیا کو کس طرح بتائیں کہ یہ سب باتیں اسلام کے خلاف ایک گہری سازش کا نتیجہ ہیں ورنہ ان کی تائید نہ خدا کی کتاب میں مل سکتی ہے اور نہ اس کے رسولِ برحق کی سیرتِ طیبہ میں۔ قرآن، جھوٹ۔ فریب۔ دغابازی عہد فراموشی۔ معاہدہ شکنی۔ حصولِ مقصد کی خاطر ناجائز ذرائع اختیار کرنے کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ دنیا کو صداقت۔ راستبازی۔ دیانت۔ امانت۔ حق گوئی اور بے باکی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا عملی مجسمہ رسولِ اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ تھی۔ اس تعلیم اور اس سیرتِ طیبہ سے اسلام نے ایک ایسی جماعت تیار کی جس کی ہر بات پر دوست تو ایک طرف، دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد تھا۔ جس کے متعلق ہر شخص کو یقین تھا کہ وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرے گی۔ کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔ اپنے بیان کردہ اصولوں سے کبھی نہیں ہٹے گی۔ مثلاً عدل، اس کا اصول ہے تو وہ دشمن سے بھی عدل کرے گی۔ جو اس کی پناہ میں آجائے گا (خواہ میدانِ جنگ میں ہی کیوں نہ ہو) اسے اس کے مامن تک پہنچائے گی۔ اس کے ہاتھوں ہر شخص کی جان۔ مال۔ عزت۔ ناموس۔ معبد۔ محفوظ ہوں گے۔ وہ کسی مصلحت کی خاطر مداہنت سے کبھی کام نہیں لے گی نہ ہی کسی مفاد کے حصول کی خاطر باطل سے مفاہمت کرے گی۔ وہ بات کی پکی۔ وعدے کی سچی ہوگی۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوگا، اس کی دوستی بھی کھلی اور دشمنی بھی کھلی ہوگی۔ یہ تھی وہ دست پروردگانِ رسالت کی وہ جماعت جن کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی فرق نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جاتا۔ ان کا ایمان تھا کہ قرآن نے سیدھے راستے پر چلنے کی دعا اسی لئے سکھائی ہے کہ سیدھا راستہ (جائز ذریعہ) ہی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ راہبرو حیات کی سیرت و کردار کا مظاہرہ جیسا منزل پر پہنچ کر ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ دورانِ سفر میں ہوتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص راستہ بھر جھوٹ بولے۔ فریب دے۔ اور منزل پر پہنچ کر

بجائے یک صد نقص شعار بن جائے۔ یہ تھے وہ حضرات جن کی زندگیاں حق گوئی اور راستبازی کی روشن قندیلیں تھیں۔ اگر تاریخ کا کوئی واقعہ یا کسی راوی کا کوئی بیان اس کے خلاف کوئی بات ان کی طرف منسوب کرتا ہے، تو وہ یکسر غلط اور بے بنیاد ہے ان کا دامن اس قسم کے اتہامات سے پاک ہے۔ جو سچا مسلمان ان حضرات کی بلند سیرت اور پاکیزہ زندگی پر یقین رکھتا ہے اس کے سامنے جب اس قسم کی وضعی روایات آتی ہیں تو وہ بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ اس کے برعکس جو شخص ان وضعی روایات کا سہارا لے کر اپنے کذب و فریب اور مکر و دجل کو تقدس کا نقاب اوڑھانا چاہتا ہے وہ اسلام کا سب سے بڑا مخالف اور ان مقدس و پاکباز ہستیوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ اپنی میکیاوَلی سیاست کو مذہب کے پردے میں چھپانے کی ناپاک کوشش کرتا اور دنیا کو بدترین قسم کا دھوکا دیتا ہے۔ اس کی ذہنیت بڑی پست اور فطرت سخت گھناؤنی ہے کیونکہ وہ اپنے عیوب کو حسن اور اپنی برائیوں کو نیکیاں ثابت کرنے کے لئے عالم انسانیت کی بلند ترین ہستیوں کو اپنی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور اس سے قطعاً نہیں شرماتا کہ دنیا ان ہستیوں کی سیرت و کردار کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔

اس سے آپ نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ طلوع اسلام کو "منکر حدیث" قرار دے کر عوام میں بدنام کرنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا ہے اور وہ کس قسم کی حدیثیں ہیں جن کے صحیح ہونے سے طلوع اسلام انکار کرتا ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ میکیاوَلی سیاست جسے پاکستان میں اقامت دین کے نام سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اور یہی وہ مقدس حربے جنہیں "صالحین" کی طرف سے آنے والے الیکشن میں "خدا اور رسول" کے نام پر استعمال کیا جائیگا۔ ہمیں ان حضرات کی اس روش پر نہ ذرا سا تعجب ہے نہ افسوس۔ دنیا کا کوئی دور بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہا۔ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری سادہ لوح قوم میں ابھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو اس قسم کے مفاد پرستوں کے دام تزویر میں پھنس کر ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جس قوم کو سیاسی راہ نماؤں کی بے نقاب اور مذہبی پیشواؤں کی نقاب پوش اقتدار پسندیاں اور ہوس رانیاں اس طرح نوچ کھسوٹ رہی ہوں اس قوم کا خدا حافظ!

ہر یک نخچیر صد نخچیر گیر۔

اعتذار طلوع اسلام کی زندگی میں یہ پہلا "حادثہ" ہے کہ پرچہ اس قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کراچی سے لاہور منتقل ہونے پر جدید ڈیکلریشن کی ضرورت تھی جس کے لئے بہت پہلے سے کوشش شروع کر دی گئی تھی مئی میں ڈیکلریشن نہ مل سکا تو جون کا پرچہ حسب سابق کراچی سے شائع کیا گیا۔ جون میں ڈیکلریشن مل جانے کی امید تھی لیکن وہ خدا خدا کر کے اب جا کر ملا ہے امید ہے کہ ناظرین ہماری اس معذوری کو قابل پذیرائی تصور فرمائیں گے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پیشکش برائے طباعت لغات القرآن

معطیان کی سہولت کی خاطر ذیل میں ان عطیوں کی مکمل فہرست پیش کی جاتی ہے جو شروع سے لے کر ۲۰ جون ۱۹۸۵ء تک ادارہ کو موصول ہوئے۔ درخواست ہے کہ آپ فہرست میں متعلقہ اندراجات کو چیک کرلیں اور اگر حساب میں کوئی غلطی نظر آئے تو اس سے ہمیں مطلع فرمادیں۔

منجانب بزم ہائے طلوع اسلام

پیش کنندہ — مقام	وعدہ	سابقہ	رقم موصولہ [illegible]	پیش کنندہ — مقام	وعدہ	سابقہ	رقم موصولہ [illegible]
جناب سراج الدین صاحب قلعہ آباد	100	—	—	جناب نصراللہ خان صاحب سرگودھا	500	—	—
" عبدالغفور محسن صاحب کوئٹہ	100	—	—	" ظفر عباس صاحب جھنگ	500	—	—
" حافظ شاہ حسینی صاحب ٹنڈو محمد خاں	200	—	—	" مرزا علی احمد صاحب پشاور	2000	1120	—
" نہال خان صاحب جام پور	200	—	—	" غلام ربانی صاحب ٹیکسلا	50	—	—
" غلام جیلانی صاحب شیخوپورہ	200	150	50	" بخت جمال خان صاحب سیالکوٹ	5000	1500	—
" عبدالجلیل صاحب اسعید قطر	900	—	—	" عدالت حسین صاحب ایبٹ آباد	200	—	—
" محمد رفیق صاحب قاضیاں	300	—	—	" محمد اختر صاحب واہ چھاؤنی	875	375	—
" مشتاق احمد صاحب ڈیرہ غازیخاں	250	100	—	" محمد گل صاحب لاڑکانہ	300	125	—
" گلزار حسین صاحب لائلپور	500	150	—	" عطا محمد صاحب پنج کسی	200	200	—
" عبدالحکیم صاحب مردان	1000	200	—	" زبیر عزیز صاحب اوکاڑہ	1000	600	—

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	رقم موصولہ: سابقہ	رقم موصولہ: [illegible]
جناب محمد اسمٰعیل صاحب	گوجرانوالہ	200	-	—
〃 عبداللطیف نظامی صاحب	لاہور	5000	380	250
〃 محمد اکبر صاحب	دیونہ منڈی	200	50	—
〃 نوراحمد صاحب	کویت	235	235	—
بزم طلوع اسلام	قصور	100	100	—
بزم طلوع اسلام	ہنگو کوہاٹ	100	100	—
〃 〃	کراچی	5500	5500	—
〃 〃	سیدحسن جہلم	70	70	—
لاہور مرکزی فنسنگ		2411	2411	—
میزان		28041	13416	300

انفرادی پیش کش

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	رقم موصولہ: سابقہ	رقم موصولہ: [illegible]
جناب روشن خاں صاحب	کراچی	2000	2000	—
〃 ڈاکٹر رضا محمد خاں صاحب	مردان	500	200	—
〃 ابوالاثر حفیظ جالندھری [illegible]		1000	—	—
〃 فضل کریم صاحب	مردان	200	—	—
〃 خواجہ رسول صاحب	پنڈدادنخان	100	—	—
〃 میر غلام حسین صاحب	جھنگ	1000	500	—
〃 حاجی خیر محمد پراچہ صاحب	کراچی	6000	6000	—
〃 عبدالعزیز صاحب	داہران	100	100	—
〃 گمنام	کراچی	100	100	—
〃 محمد شفیع صاحب	لاہور	50	60	—
〃 گمنام	لاہور	200	200	—
〃 مقبول احمد صاحب	داہران	200	200	—
〃 محمد اسلم قریشی صاحب	〃	200	200	—
〃 ملک محمد اشرف صاحب	〃	100	100	—
〃 محمد اقبال صاحب	〃	100	100	—
جناب محمد اسحاق میر صاحب	داہران	200	50	38
〃 ایم۔ اے درانی صاحب	〃	100	100	—
〃 حکیم احمد دین صاحب	پنج کسی	2	2	—
〃 محمد شعیب صاحب	چار باغ	10	10	—
جنابہ مسز عبداللہ جمال صاحبہ	کراچی	10	10	—
جناب عبدالحفیظ صاحب	کراچی	200	200	—
〃 منصور احمد بٹ صاحب	کراچی	2500	2500	—
〃 خان اکرام اللہ صاحب	داہران	100	100	—
〃 محمد سعید صاحب	سیالکوٹ	500	500	—
〃 عبدالحق مرزا صاحب	کراچی	10	5	5
〃 شہاب الدین صاحب	کراچی	50	50	—
〃 رب نواز صاحب	میراں شاہ	10	—	10
〃 علاء الدین صاحب	کراچی	100	—	100
〃 ڈاکٹر انور علی صاحب	مردان	500	500	—
〃 عبدالرؤف صاحب	جلالپور جٹاں	50	50	—

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	رقم موصولہ: سابقہ	رقم موصولہ: [illegible]
جناب میجر شاہ اللہ خان صاحب	سیالکوٹ	10	10	
” حافظ شاہ حسینی [illegible]	[illegible]	50	50	
” حاجی فقیر محمد صاحب	مردان	1000	1000	
” عبداللہ خان صاحب	گوجرہ	200	200	
” محمد شفیع صاحب	کراچی	2500	2500	
” محمد افضل صاحب	کراچی	500	500	
” شیخ امین صاحب	کراچی	500	500	
” حافظ برکت اللہ صاحب	کراچی	500	500	
” مشتاق حسین صاحب	کراچی	500	500	
” محمد حنیف صاحب	کراچی	500	500	
” ڈاکٹر یوسف علی صاحب	پشاور	100	100	
” قاضی محمد رفیق صاحب	قاضیاں	10	10	

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	رقم موصولہ: سابقہ	رقم موصولہ: [illegible]
جناب محمد فاضل صاحب	راولپنڈی	100	100	
” جمیل نواز خان صاحب	[illegible]	200	200	
” عبدالکریم صاحب	حسین آباد	100	100	
” طاہر ابرار انصاری صاحب	پشاور	15	15	
” شیخ محمد حسین صاحب	گجرات	100	100	
” شبیر محمد صاحب	جھنگ	72	72	
جنابہ ثریا عندلیب صاحبہ	[illegible]	100/8	100/8	
جناب عبدالعزیز صاحب	ایران	100	100	
” ڈاکٹر محمد محتشم خان صاحب	کراچی	25	25	
” نور خان صاحب	اٹک	20	20	
” اسد حمید صاحب	کراچی	100	100	
میزان		23394/8	20824/8	653

میزان کل:-

	وعدے	رقم موصولہ
ممبرین	28,041	13,716
انفرادی	23,394/8/-	21,282/8/-
	51,435/8/-	34,998/8/-

پیشگی خریداران

یہ سلسلہ سنہ ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ گذشتہ پانچ سال میں اکثر و بیشتر زرِ پیشگی کے عوض مطبوعات دی جا چکی ہیں اور متعلقہ کھاتوں میں یا تو کچھ باقی ہی نہیں رہا ہے یا آمد سے خرچ زائد ہو چکا ہے۔ زائد خرچ کی ادائیگی کے لئے فرداً فرداً یاددہانی کرائی جا چکی ہے۔

زرِ پیشگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابلِ قدر مدد ملی ہے اس لئے اس سلسلہ کا جاری رکھنا بہمہ وجوہ مستحسن ہے۔ توقع ہے کہ جن احباب کا زرِ پیشگی ختم ہو چکا ہے . . . .

. . . وہ مزید ایک سو روپے یکمشت یا باقساط ارسال فرما کر اس مفید کام میں حصہ لیتے رہیں گے۔

قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جو تا حال پیشگی خریدار نہیں بنے ہیں ان کی توجہ اس مفید سلسلے کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے تاکہ وہ اس میں جلد از جلد شامل ہو جائیں۔

پیشگی خریدار بن کر آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں معتدبہ امداد کچھ خرچ کئے بغیر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس اسکیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک سو روپے کی رقم ادارہ کے پاس جمع کرا دیں۔ ادارہ اپنی مطبوعات جنہیں آپ لینا پسند کریں آپ کو گھر بیٹھے پہنچاتا رہے گا اور محصول ڈاک بھی اپنے پاس سے ادا کریگا۔ اس طرح آپ کو آپ کے جمع کردہ روپے کی کتابیں بلا محصول ڈاک مل جائیں گی۔ ہمیں ہمارا فائدہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں کچھ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام 25/B گلبرگ کالونی۔ لاہور

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (۲۱/۱۰)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے۔

من و یزداں

خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟

ایک بیحد اہم اور سخت مشکل سوال کا نہایت آسان اور شگفتہ جواب

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام 25/بی گلبرگ کالونی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من و یزداں

[محترم پرویز صاحب کے سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی جلد کا عنوان تھا "اللہ"۔ اس میں صفات خداوندی کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ یہ جلد دو ایڈیشنوں میں شائع ہونے کے باوجود مدت سے نایاب تھی۔ پرویز صاحب کی توجہ کئی بار اس کی جدید اشاعت کی طرف منعطف کرائی گئی لیکن انھوں نے اسے ہمیشہ یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ اس کی باری اس سلسلہ کی تمام کڑیوں کی اشاعت کے بعد آئے گی۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے اسے نظرِ ثانی کے لئے اٹھایا تو ہم نے دیکھا کہ کتاب کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اب انھوں نے صفاتِ خداوندی کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا کہ خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے اور صفاتِ خداوندی پر ایمان لانے سے مقصود کیا ہے۔ یہ کتاب نظرِ ثانی کے بعد پریس میں چلی گئی ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گی۔

ہم ذیل میں اس کا پہلا باب شائع کرتے ہیں اس سے آپ کتاب کے مشمولات کا اندازہ لگا سکیں گے۔ علاوہ ازیں، یہ موضوع بجائے خویش اس قدر اہم ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا طلوعِ اسلام میں ایک مقالہ کی حیثیت سے اور پھر الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع ہونا، اپنی جداگانہ افادی حیثیت رکھتا ہے۔

اب دیکھئے کتاب "من و یزداں" کا باب اوّل۔

طلوعِ اسلام]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من و یزداں

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب کی بنیاد خدا کے ایمان پر ہے۔ مختلف مذاہب میں خدا کا نام بدل جائیگا۔ لیکن اس کی ہستی کا اقرار اس پر ایمان، ہر جگہ شرطِ اولین ہو گا۔ اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اُسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات، جیسا کہ ظاہر ہے، بڑے اہم۔ بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں۔ اور جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے، وہ ان کے جوابات کے لئے مصروفِ تحقیق و کاوش ہے۔

سوال کی اہمیت

قرآن نے بھی دین کی عمارت، ایمان باللہ کی بنیادوں پر استوار کی ہے۔ اس لئے قرآن کے طالب علم کے سامنے بھی وہ سوالات آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ چونکہ ان سوالات کی اہمیت قرآن کے سامنے تھی اس لئے اس نے ان کا جواب بڑی شرح و بسط سے دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بلند حقائق کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی بصیرت کے مطابق ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھ سکا ہوں، اسے (ذیل کی سطور میں) مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ موضوع بڑا مشکل اور یہ مقامات بڑے نازک ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے قارئین اسے پورے جذب و انہماک سے پڑھیں گے اور انتہائی غور و تدبر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سعی و کاوش سے قرآنی فکر کی مزید راہیں ہم پر کھل جائیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزر جیئے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے۔ ایک چیز آپ کو بلا لحاظ زمان و مکان بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی۔ یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور۔ کسی فوق البشر قوت کا احساس۔ جس کے سامنے جھکا جائے۔ جس کی پرستش کی جائے۔ جس سے مرادیں مانگی جائیں۔ جس سے ڈرا جائے۔ جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں۔ جس کے چرنوں میں

شرِ عار (عقیدت) کے پھول چڑھائے جائیں۔ دنیا کے سیاح، مغربی محققین اور مکتشفین اگر کسی ایسے علاقہ میں بھی پہنچے ہیں جہاں اس سے قبل، کسی باہر کے انسان کے نقوش قدم دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے (تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا) یکسر حیوانی سطح کی وحشت و درندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ، ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی۔ بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔

تصور میں اختلاف

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا تصور اور اس کی تقاضیں ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں، ایک قبیلے کا "معبود" دوسرے قبیلے کے "معبود" سے نہیں ملتا۔ ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک کے "خدا" سے مختلف ہے۔ ایک قوم کا "دیوتا" دوسری قوم کے "دیوتا" سے جداگانہ ہے۔ ایک فرقے کا "ایشور" دوسرے فرقے کے "ایشور" سے متبائن ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر تک، مغربی محققین کے ایک گروہ کا خیال تھا (اور ممکن ہے اب بھی اس خیال کے مؤید وہاں موجود ہوں) کہ ابتدائی دور کے انسان نے جب دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں (مثلاً موسمی تغیرات۔ طوفان باد و باراں۔ یا وبائی امراض وغیرہ) جن کے علل و اسباب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور ان کے ذہن کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، ان حوادث کے پیچھے کوئی بہت بڑی قوتیں ہیں جو انہیں نظر نہیں آتیں۔ اس طرح ان کے ذہن میں "خدا" کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا اور انسان ترقی کرتا گیا، اس تصور میں بھی جدت پیدا ہوتا گیا۔ اس طرح بتدریج "خدا" کا وہ تصور وجود میں آگیا جو

ایک نظریہ

دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو "خدا کے تصور کا ارتقاء" کہا جاتا ہے جس کی تفصیل گرانٹ ایلن (Grant Allen) کی کتاب

The Evolution Of The Idea of God

یا فریزر (FRAZER) کی (Golden bough) وغیرہ کتابوں میں ملے گی۔ لیکن بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی اور کہا کہ خدا کا صحیح تصور شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ اس میں تدریجی ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں

اس کی تردید

ہوتا۔ چنانچہ عصرِ حاضر کا مشہور مؤرخ، ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی (Dr. Arnold Toynbe) اپنی کتاب (An Historian's Approach To Religion) میں لکھتا ہے کہ

> (پروفیسر) شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے۔ (صفحہ ۱۹)

پروفیسر شمٹ (Schmidt) کی جس کتاب (The Origin And Growth Of Religion)

سے ڈاکٹر آرنلڈ نے مذکورہ صدر نتیجہ پیش کیا ہے، وہ اس موضوع پر عصر حاضر کی بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "انسان کے ابتدائی تمدن میں جس "بلند ہستی" کا تصور پایا جاتا ہے، وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسل انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے متعلق ان کا یہی تصور تھا۔ لہٰذا ارتقائی مذہب کا نظریہ اب عمرانیات کے پورے میدان میں یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے"۔ چونکہ ہماری اس کتاب کا موضوع، خدا کے تصور یا عقیدہ کا تاریخی استقصا نہیں، اس لئے ہم اس نقطہ کی مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھتے ہمارے مقصد پیش نظر کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے

قرآن کا تصور

انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے بوساطت انبیاء کرام، وحی کی راہ نمائی آنی شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اس علم (وحی) کا سرچشمہ ابدی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے آخر تک ایک ہی ہوگا۔ (اور ایک ہی تھا) لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس ماننوبالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا۔ کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی صفات دلقعہ پہلے کے پیش نظر ان کے مجسمے کھڑے کرتا۔ بت تراشتا۔ چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا ــــ اندر۔ اگنی۔ سورج۔ چاند گنگا۔ جمنا۔ سانپ۔ گائے۔ بیل۔ سب اسی جذبہ خوف واُمید (یعنی دفع مضرت اور جلب منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں جب ذہن انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جاتیں، تو پھر ایک اور رسول آ جاتا اور خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان تو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ تمام اشیائے فطرت کو مسخر کرے اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ سمندروں کی شورانگیزیاں۔ پہاڑوں کی گراں سامانیاں۔ تحت الثریٰ کی آتش افشانیاں۔ اوجِ ثریا کی طلعت آفرینیاں اور نور پاشیاں۔ دریاؤں کی (رگاہ) وحشت خیز تلاطم خیزیاں اور (رگاہ) سکون افزا روانیاں۔ ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں۔ خوفناک صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افزائیاں۔ غرضیکہ یہ جملہ کائنات اور اس کے مختلف اور متنوع مظاہر۔ سب انسان کے سامنے باتھ باندھے خدمت کے لئے کھڑے ہیں۔ لہٰذا ان چیزوں کے سامنے جھکنا اور انہیں اپنا آقا اور حاکم تصور کرنا چہ معنی؟

وحی کا یہ سلسلہ، اسی نہج و انداز سے جاری رہا۔ تا آنکہ جب ذہنِ انسانی سنِ شعور کے قریب پہنچ گیا تو خدا کا یہی پاکیزہ اور منزہ۔ صاف اور شفاف۔ بلند و بالا تصور، ایک مکمل صورت میں، قرآن کے اندر دے دیا گیا اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ اب، خدا کا صحیح تصور (جیسے خود خدا نے بیان کیا ہو) اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں (جس میں ذہنِ انسانی کی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو) قرآن کی دفتین کے اندر ہے۔ اس سے باہر اور کہیں نہیں۔ اس لئے کہ آج دنیا کا کوئی مذہب

بھی اس کا دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ وہ جس کتاب کو آسمانی کتاب کہتے ہیں، وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر کو خدا کی طرف سے ملی تھی۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب، مطالعاتِ انسانیت کے باب اول۔ ظہر الفساد فی البر والبحر میں ملے گی)۔ لہٰذا جو شخص چاہتا ہے کہ اسے خدا کے متعلق وہ تصور مل جائے جسے خود خدا نے بیان کیا ہے، تو اس کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن نے خدا کا تصور کیا پیش کیا ہے۔

ذاتِ خداوندی

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود (Finite) ذہن، لامحدود (Infinite) کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تو بہت بڑی چیز ہے۔ دورِ حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتلاتے ہیں کہ زمان (Time) کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان (Space) کی کوئی انتہا نہیں۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا۔ اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ وہ ہے۔ نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا۔ نہ فضا کا کوئی آخری کنارہ ہے۔ فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتاتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک "لاابتدا" زمان یا "لاانتہا" مکان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کیجئے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ آپ جتنا زیادہ زور ذہن پر ڈالیں گے اتنی ہی جلدی آپ جھنجلا اٹھیں گے۔ سو جب، زمان اور مکان کے تصور کی یہ حالت ہے[1]، تو خدا کی ذات کا تصور (جو زمان و مکان کا خالق ہے) کس طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں آسکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا صرف یہ بتایا ہے کہ اس کی صفات (Attributes) کیا ہیں۔ قرآنی تعلیم کی عظمت اور بے مثالیت کا بنیادی گوشہ یہ ہے کہ ان صفات کی رُو سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے، اس سے بلند

صفاتِ خداوندی

پاکیزہ۔ اور مکمل تصور اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) انسانی زندگی کے مقصود و منتہیٰ کا تعین، خدا کے تصور پر موقوف ہے۔ جس قسم کا خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا، اسی قسم کی اس فرد کی زندگی اور اس جماعت (یا قوم) کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ فلہٰذا خدا کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے، جب وہ بے مثل و بے نظیر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس تصور کی رُو سے انسانی زندگی کا جو مقصود و منتہیٰ ہوگا اور اس کے حصول کے لئے جو راستے قرآن نے تجویز کئے ہوں گے (جنہیں وحی کی راہ نمائی کہتے ہیں) وہ بھی بے مثل و بے نظیر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کاروانِ انسانیت کو جو راہ نمائی قرآن کی رو سے

---

[1] زمان و مکان تو پھر بھی مجرد (Abstract) مباحث ہیں۔ ذہنِ انسانی کی تو یہ حالت ہے کہ ہم بچوں کو جیومیٹری کا سب سے پہلا سبق یہ پڑھاتے ہیں کہ نقطہ (Point) کا نہ طول ہوتا ہے نہ عرض اور نہ ہی وہ جگہ گھیرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مرئی (Visible) ہوتا ہے۔ آپ کسی ایسی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو طول۔ عرض اور حجم نہ رکھے اور اس کے باوجود مرئی اور محسوس ہو۔ بایں ہمہ ہم نقطہ کے وجود کو مانتے ہیں اس لئے کہ اس کی اس تعریف (Definition) پر جیومیٹری جیسے اہم علم کی ساری عمارت اٹھتی ہے۔

ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جس قسم کا خدا (یعنی صفاتِ خداوندی) کا تصور ہمارے سامنے ہوگا۔ اس قسم کی ہماری (انفرادی اور اجتماعی) زندگی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا خدا کے تصور کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

انسانی زندگی

انسانی زندگی کی ایک سطح تو وہ ہے جسے حیوانی سطح (ANimal Level) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی خالص مادی پیکر (آب و گل) کی زندگی ہے جس کا مقصد (دیگر حیوانات کی طرح) تحفظِ خویش (preservation of Self) اور تولیدِ نسل (Procreation) ہے۔ یہ زندگی اس دنیا کی (طبعی) زندگی ہے اور موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے مادی تصورِ حیات (Materialistic concep of Life) کہتے ہیں۔

لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی صرف طبعی (حیوانی) زندگی سے عبارت نہیں۔ اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات (personality) یا انسانی نفس (Self) یا انا یا ایغو (Ego) کہتے ہیں۔ قرآن اسے "روحِ خداوندی" (الوہیاتی توانائی یا Divine Energy) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ ۳۲/۹) انسانی جسم تو ہر آن بدلتا رہتا ہے لیکن انسانی ذات خارجی تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان اپنی طبعی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا اور حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر معارف القرآن کی سابقہ کڑیوں (ابلیس و آدم اور انسان نے کیا سوچا) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ اس لئے اس مقام پر صرف انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ "انسان نے کیا سوچا" کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ جائے گی کہ دورِ حاضرہ کے مغربی مفکرین اور سائنسدان کس طرح رفتہ رفتہ، انسانی ذات کے متعلق قرآن کے پیش کردہ تصور سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس امر کا اعتراف کر رہے ہیں کہ انسانی زندگی کا موت کے ساتھ خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

انسانی ذات

قرآن نے انسانی ذات کو "روحِ خداوندی" کی اصطلاح سے تعبیر کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

(۱) خدا کی بھی ایک ذات (Personality) ہے اور انسان کی بھی ایک ذات (personality) ہے۔ واضح رہے کہ انسان کی ذات، خدا کی عطا کردہ ہے، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (personality) ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible unit) ہوتی ہے جو حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اور جب انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو (یعنی حصہ) نہیں تو (ویدانت یا تصوف کا) یہ عقیدہ کہ انسانی ذات آخر الامر، ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جائے گی، اور اس طرح جزو اپنے کل سے مل جائے گا (جس طرح قطرہ دریا سے مل جاتا ہے) قرآن کے یکسر

خلاف ہے۔

(۲) ذات (personality) جہاں بھی ہوگی اس کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ایک ہی ہوں گے۔

(۳) خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔ قرآن انہیں اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اُس کی ذات کے مختلف شئون یا (Facets) ہیں۔

(۴) انسانی ذات ایک ممکن ہوئی شکل میں اور (ذاتِ خداوندی کے مقابلہ میں) محدود ہے اس لئے اس کی صفات بھی (خدا کی صفات کے مقابلہ میں) بھی محدود ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس میں (محدود طور پر) وہ تمام صفات موجود ہیں جنہیں (خدا کے سلسلہ میں) اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ بجز ان صفات کے جو خدا کی لامحدودیت سے متعلق ہیں (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)

(۵) خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں لیکن انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی (Realisable possibilities)۔ یا مضمر (Latent) یا مستتر (Potent) یا خوابیدہ (Dormant) شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کا مشہود (Manifest) یا بارز (Actualise) کرنا انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اس کو انسانی ذات کی نشوونما (Development) کہتے ہیں۔

(۶) ظاہر ہے کہ ایک نچلی سطح کی (Lower) ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لئے کسی بلند (Higher) ذات کو بطور معیار (Standard) اپنے سامنے رکھے اگر انسان کے سامنے اس قسم کا معیار نہ ہو تو وہ کبھی یقین سے کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے صفاتِ خداوندی کو بطور معیار اپنے سامنے رکھے۔

قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل و وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ انسان کے لئے ان کے معیار (سٹینڈرڈ) بننے میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہ رہے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے، وہ (قرآن کے الفاظ میں) "خدا کے رنگ میں رنگا جاتا" یا اس کا "قرب" حاصل کرتا جاتا ہے۔

(۷) خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا۔ ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا اور انسان کا بنیادی تعلق کیا ہے اور اس کے لئے صفاتِ خداوندی کا اپنی حقیقی اور جلا آمیز شکل میں سامنے ہونا کس قدر ضروری ہے۔ خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ انسان کا اپنی ذات کے وجود پر ایمان ہے جو اسے حیوانی سطح کی زندگی سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ مغرب کے مادی (میکانکی) تصورِ حیات اور قرآنی تصورِ زندگی کا یہ بنیادی فرق ہے اور اس فرق سے دونوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ راستے بھی مختلف اور منزلیں بھی مختلف۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ یوں تو ذات (personality) کی ہر خصوصیت اپنی جگہ اہم ہوتی ہے لیکن ان میں سے دو خصوصیات ایسی ہیں جنہیں بنیادی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی حرّیت (Freedom) اور استغنا (Independence)۔ استغنا کے معنی ہیں اپنی ذات میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا بغیر کسی خارجی سہارے کے از خود قائم رہنا۔ (اسے قرآن کی اصطلاح میں صمدیت کہتے ہیں)۔ اور حریت سے مراد ہے صاحب اختیار و ارادہ ہونا۔ کسی کا محکوم نہ ہونا۔ خدا جو ذاتِ مطلق اور مکمل ہے وہ انتہائی شکل میں غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (۲۶۷) اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۱۱/۱۰۷) ہے۔ یعنی اس میں صمدیت اور حریت کی صفات اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں (صمدیت کے متعلق تو ہم کسی دوسرے مقام پر گفتگو کریں گے)، جہاں تک حریت کا تعلق ہے، خدا مطلق قوتوں اور لا محدود اختیارات کا مالک ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اس نے خود ہی اپنے اختیارات اور اقتدارات پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں یعنی (self -imposed Limitations) مثلاً قرآن میں ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (۶/۱۲) اللہ نے اپنے اوپر اشیائے کائنات کی ربوبیت (یعنی انہیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانا) فرض کر رکھا ہے۔ دیکھئے۔ یہ ایک پابندی ہے۔ لیکن اس قسم کی پابندیوں سے اس ذات کی حریت پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا۔ اس سے وہ کسی غیر کی محکوم نہیں ہو جاتی۔ محکومی، خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندیوں کو کہتے ہیں۔ خود عائد کردہ قیود کی پابندی، محکومی نہیں کہلاتی۔ اگر آپ کسی کے حکم سے کسی جگہ خاص وقت پر پہنچتے ہیں تو یہ محکومی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنی مرضی سے وقت کی پابندی کرتے ہیں تو اسے محکومی نہیں کہا جائے گا۔ یہ اصول پرستی ہوگی۔

ذات کی بنیادی خصوصیتیں

پابندیاں

خدا کا اپنے مطلق اختیارات پر خود ہی پابندیاں عائد کر لینا ایک عظیم حقیقت کا مظہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اپنے اختیارات اور قوتوں کو ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کی طرح استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ قاعدے اور قانون کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اور "قاعدے اور قانون" سے مطلب یہ ہے کہ خارجی کائنات میں جس قسم کے حالات کا تقاضا ہو وہاں اسی قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھئے کہ جس قسم کے خارج میں حالات ہوں اسی کے مطابق خدا کی طرف سے ردِ عمل (Re -Action) ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ جب خدا کے لئے "ردِ عمل" کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس سے وہ مفہوم قطعاً مقصود نہیں ہوتا جو مفہوم انسانی ردِ عمل کا ہوتا ہے۔ انسانی ردِ عمل کی بنیاد، بیشتر صورتوں میں، جذبات پر ہوتی ہے۔ اور خدا کی ذات، جذبات سے منزہ ہے)۔ یہ حقیقت کہ خاص حالات میں خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوتا ہے "قانونِ خداوندی" کہلاتی ہے۔ اور چونکہ خدا کی صفات غیر متبدل ہیں اس لئے قوانینِ خداوندی بھی غیر متبدل ہوتے ہیں۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۱۰/۶۴) "قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی"۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (۳۵/۴۳) "تم قانونِ خداوندی میں تبدل و تحول ہرگز نہیں دیکھو گے"۔ اسی عظیم حقیقت کا اعلان ہے۔ اس سے تمی

سنّت اللہ کا مفہوم

یہ ہیں کہ نظام کائنات "فطرت کی اندھی قوتوں" کی رُو سے نہیں چل رہا بلکہ غیر متبدل اور متعین قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ قرآن نے مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ کائنات پر بڑا زور دیا ہے۔ اسے وہ لِقَاءِ رَبِّ (۱۳/۲) (خدا کے آمنے سامنے ہونے) کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مطالعۂ فطرت سے قوانین خداوندی بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور چونکہ قوانین خداوندی سے دراصل مراد یہ ہے کہ کن مواقع پر خدا کی کونسی صفات کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے مطالعۂ فطرت سے حقیقی مقصود خود صفات خداوندی کا مطالعہ ہے (اور آگے بڑھئے تو) چونکہ انسانی ذات کی صفات، صفات خداوندی

مُطالعۂ فطرت

کی محدود اور سمٹی ہوئی شکل ہیں، اس لئے مشاہدۂ کائنات اور انسانی ذات کا مطالعہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن "انفس" اور "آفاق" (۴۱/۵۳) دونوں میں آیات خداوندی کی نمود بتاتا ہے۔ اس سے (ضمناً) آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ مغرب کے مادہ پرست سائنسدان کے مطالعۂ فطرت اور قرآن کی راہ نمائی میں مطالعۂ فطرت میں کتنا بڑا فرق ہے۔ مغربی سائنسدان، کارگہ کائنات میں فطرت کی قوتوں اور ان کے طریق کار کا علم حاصل کرتا ہے لیکن ایک قرآنی محقق اس علم کے علاوہ، اشیائے فطرت میں صفات خداوندی کی نمود اور (چھوٹے پیمانے پر) خود اپنی ذات کے مضمر امکانات کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھتا ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کے قوانین، از خود جاری و ساری ہیں اور ہر شے ان کی پابندی پر مجبور۔ ان میں سے کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین سے کسی قسم کی سرتابی کر سکے۔ وہ سب ان کے سامنے سربسجود ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۵) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانین خداوندی کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ لیکن انسان کو چونکہ ذات (personality) عطا ہوئی ہے اور ذات کی بنیادی خصوصیت حریت (Freedom) ہے، اس لئے انسان کو ان قوانین کی پابندی پر مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کی پابندی کرے اور چاہے ان سے سرتابی اختیار کرے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) جس کا جی چاہے انہیں تسلیم کرے۔ جس کا جی چاہے

انسان اور پابندیٔ قوانین

ان سے انکار کر دے۔" اگر وہ ان قوانین کی پابندی کرے گا تو اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے گی۔ نہ کرے گا تو اس کی ذات دبی ہوئی (Un - Develo loped) رہ جائے گی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰) جس کی ذات کی نشوونما ہو گئی وہ کامیاب و کامران ہو گیا اور جس کی ذات دبی ہوئی رہ گئی وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

اس سے ہمارے سامنے دو تین اہم باتیں آجاتی ہیں۔

(۱) قوانین خداوندی کی پابندی، خارج سے عائد کردہ احکام کی (کرہاً مجبوراً) پابندی نہیں ہوتی بلکہ انسانی ذات کی از

عائد کردہ قیود کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے اسے اطاعت سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو بطیبِ خاطر دل کی پوری رضامندی سے کرنا۔ جو کام مجبوراً کیا جائے اس سے انسانی ذات کی نشو ونما ہونا تو کجا، وہ دب کر اور کچل کر رہ جاتی ہے۔

(۲) یہ قوانینِ خداوندی، چونکہ صفاتِ خداوندی کے مظاہر ہوتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت، خود انسانی ذات کے معیارِ اعلیٰ کا اتباع ہوتی ہے۔ یعنی اس کے رنگ میں رنگے جانے اور اس کے قالب میں ڈھل جانے کی آرزو اور کوشش۔ بالفاظِ دیگر، ان سے انسانی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔ (مثلاً) جیسے طبعی دنیا میں جب کسی کو پیاس لگے اور کوئی اس سے کہے کہ پانی پی لو۔ تو یہ اس کے "حکم کی تعمیل" نہیں ہوگی بلکہ اپنے جسم کے طبعی تقاضا کی تسکین ہوگی۔

(۳) ان قوانین کی اطاعت سے ایک طرف انسانی ذات کا اثبات (Affirmation) ہوتا ہے اور وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیتا ہے کہ اس کا مقام تمام خارجی کائنات سے بلند ہے۔ دوسری طرف، اس سے (اپنی ذات کے مقابلہ میں)، ذاتِ خداوندی کی عظمت اور بلندی ابھر کر سامنے آجاتی ہے، جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ وہ جہاں ساری کائنات سے ارفع و اعلیٰ ہے وہاں اپنے معیارِ کبریٰ (ذاتِ خداوندی) کے مقابلہ میں بہت نیچے ہے۔ (صلوٰۃ میں قیام اور سجدہ انہی دونوں احساسات کے مظہر ہیں۔ قیام میں، تمام کائنات کے مقابلہ میں، انسانی ذات کا اثبات اور ارتفاع مقصود ہوتا ہے۔ اور رکوع و سجود میں، انسانی ذات کا ذاتِ خداوندی کے مقابلہ میں خضوع و تعبد)

(۴) اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شے انسان کی رفیق نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ کائنات میں صاحبِ ذات (personality) کا مالک) صرف انسان ہے۔ مذہب کا مادہ پرست (Materialist) چونکہ اپنے آپ کو (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مادہ کی پیداوار (یا از قبیلِ مادہ) سمجھتا ہے اس لئے وہ اس جہانِ رنگ و بو میں جذب ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآنی تصورِ حیات پر یقین رکھنے والا، اس محسوسات کی کائنات میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اس کا رفیق کوئی دوسرا صاحبِ ذات ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی برابر کی سطح پر ایک انسان کا رفیق، دوسرا انسان ہو سکتا ہے۔ اور بلند درجہ پر انسان کا رفیق، خود خدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے خدا کو "الرفیق الاعلیٰ" کہا ہے۔

خدا کا رفیق

خدا سے رفاقت کا تعلق ہمیں حقیقت کے ایک اور اہم گوشے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں بعض جلدی سے بعض بہت دیر میں۔ مثلاً درخت کے بیج میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی نشو ونما کی جائے تو وہ ایک دن تناور درخت بن کر سامنے آجائے گا۔ یہ نتیجہ ہماری زندگی میں ہمارے سامنے آسکتا ہے۔ لیکن فطرت کی بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن کے نتائج ہزارہا سال کے بعد جاکر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً زندگی کے اولین جرثومہ کا مختلف ارتقائی مراحل

طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچا۔ یہ کہیں کروڑوں برس کے بعد جاکر ہوا۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر فطرت کے ساتھ انسان کا ہاتھ شامل ہو جائے تو نہ صرف اس مدت میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے جس میں کسی شے نے تنہا فطرت کے قاعدے کے مطابق نتیجہ خیز ہونا تھا بلکہ اس کے حسن و رعنائی اور افادیت و نفاست میں بھی بیش بہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہی پودہ جو عام حالات میں تین ماہ کے بعد پھول کھلاتا تھا۔ اور وہ بھی صرف ایک رنگ کا۔ یہ رب کی تجربہ گاہوں میں چوبیس گھنٹے میں، چار چار مختلف رنگوں کے پھول سامنے لے آتا ہے۔ یعنی جب انسان، قوانینِ خداوندی کا رفیق بن جاتا ہے تو خدا کے تخلیقی پروگرام کی رفتار میں تیزی آجاتی اور نتائج میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

قوانینِ خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کی جو شکل خارجی کائنات میں ہے وہی صورت انسانی دنیا میں بھی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) کائنات میں اصول یہ کارفرما ہے کہ یہاں حق و باطل میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس کشمکش میں حق، باطل کا سر توڑ دیتا ہے۔ اور اس طرح باطل آخرالامر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یعنی تعمیری قوتیں، آخرالامر تخریبی قوتوں پر غالب آجاتی ہیں اور اس طرح کائنات اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھے چلی جاتی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اس قانون کو اگر فطرت کے منہاج پر چھوڑ دیا جائے تو حق کو باطل پر غالب آنے کے لئے معلوم کتنی صدیاں لگ جائیں۔ اس لئے کہ، جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے، "خدا کا ایک دن" ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار (۲۲/۴۷) اور پچاس پچاس ہزار (۷۰/۴) سال کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کی رفاقت شامل ہو جائے تو حق کا یہی غلبہ چند دنوں میں سامنے آسکتا ہے۔ لیکن یہ رفاقت انہی انسانوں کی طرف سے عمل میں آسکتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر محکم یقین رکھتے ہوں اور ان کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہوں (ایمان اور عملِ صالح اسی کو کہتے ہیں) ایسے انسانوں کے گروہ کو جماعتِ مومنین یا حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس جماعت کی سعی و عمل سے ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کم از کم وقت میں اثر انگیز اور نتیجہ خیز ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح افراد و معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کسی صورت میں بھی انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔

فرد اور معاشرہ

یہ صرف جماعت کے اندر (قرآنی معاشرہ میں) ہو سکتی ہے۔ وہ فرد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ــ وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۲۹-۳۰) جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو خدا کے بندوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ صادقین کی معیت (كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ـ ۹/۱۱۹) اس کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خانقاہیت کی خلوت گاہوں اور رہبانیت کے تجرد کدوں کو ذہنِ انسانی کی اختراع بتایا ہے (۵۷/۲۷)۔ جو خدا کے تجویز فرمودہ دین کے یکسر خلاف ہے۔ خدا کا دین، معاشرہ کے اندر قائم ہوتا ہے۔

نشوونما یافتہ ذات (Developed personality) کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کی

نمو بلا کاوش و تردد، از خود ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح (مثلاً) سورج سے نور کی ندیاں اور حرارت کی لہریں از خود رواں دواں رہتی ہیں۔ . . . . لہذا جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی ذات نشو و نما یافتہ ہو، تو اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کا ظہور از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس معاشرہ میں تمام امور، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں طے پاتے ہیں اور یہ کچھ بلا مشقت (Without Effort) ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً تخلیق (creation) - ربوبیت (ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک بتدریج پہنچاتے جانا)۔ رزاقیت (ہر شے کو سامانِ زیست بہم پہنچانا)۔ عدل (ہر عمل کا پورا پورا معاوضہ دینا)۔ احسان (جس میں کوئی کمی واقع ہو جائے اس کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو قائم کر دینا) وغیرہ، صفاتِ خداوندی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو معاشرہ جماعتِ مومنین پر مشتمل ہوگا اس میں یہ صفات از خود ظہور پذیر ہوتی رہیں گی۔ یعنی وہ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے مطابق چلتا جائے گا۔ ذرا سوچئے کہ اس قسم کا معاشرہ کس قدر حسین، پاکیزہ، مشرفِ انسانیت ہوگا اور اس سے یہ جہنم زار دنیا کس طرح جنت میں تبدیل ہو جائے گی؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جب دنیا میں کوئی دو انسان اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی مقرر کر لیں۔ یعنی ان کے سامنے مقصود و منتہیٰ ایک ہو اور جس قالب میں وہ اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیں وہ بھی ایک ہو، تو ان میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر ہے۔

قومیت کی تشکیل

یہی وحدتِ فکر و نظر ہے جسے قرآن، انسانوں میں وجہِ جامعیت قرار دیتا ہے۔ یعنی دنیا کے دو انسان ——— وہ کہیں بستے ہوں۔ ان کا رنگ، زبان، نسل، وطن کوئی ہو۔ اگر وہ صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطورِ خارجی معیار رکھ لیں اور اس کے مطابق اپنی ذات کی نشو و نما کے لئے کوشاں ہوں، تو وہ دونوں انسان (رنگ، نسل، زبان، وطن کے بُعد اور تفاوت کے باوجود) ایک جماعت کے رکن اور ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ قرآن نے قومیت کی تشکیل کے لئے یہی معیار بتایا ہے۔ اس طرح انسانوں میں جو وحدت پیدا ہوتی ہے وہ خون، رنگ، زبان، اور وطن کے رشتوں سے کہیں زیادہ محکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ اگر یہی وحدت پھیلتی چلی جائے اور دنیا کے زیادہ سے زیادہ انسان اس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہوتے جائیں تو اس سے تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی توحید (یعنی اس کی ذات کو بطورِ معیار اپنے سامنے رکھنے) کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے سوا وحدتِ انسانیت کی کوئی اور بنیاد نہیں۔

وحدتِ انسانیت

قرآن کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام انسان، اس طرح خدا کی توحید کو اپنی زندگی کا عملی شعار بنا کر ایک عالمگیر برادری بن جائیں جس سے وہ تمام اختلافات مٹ جائیں جن کی وجہ سے آج دنیا درندوں کا کھٹ بن رہی ہے۔

خدا پر ایمان

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا کا تصور کیا ہے اور خدا پر ایمان سے مفہوم کیا۔ اس کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن، تمام دنیا کے انسانوں سے اس کا مطالبہ کیوں کرتا ہے کہ وہ اس خدا پر ایمان لائیں جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ دنیا میں چند "دہریوں" (Atheists) کو چھوڑ کر، ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر قوم، کسی نہ کسی رنگ میں "خدا" کی قائل ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمہارا اس طرح خدا کو ماننا، درحقیقت خدا کو ماننا نہیں۔ یہ اس خدا کا ماننا ہے جس کا تصور، تمہارے یا تمہارے جیسے دوسرے انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ جیسے (مثلاً) ایک شخص کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ سونا ایک اچھی دھات ہے۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ مرطوب ہوا میں اس پر زنگ لگ جاتا ہے۔ سخت چیز سے ٹکرانے سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ چونکہ دنیا میں سب سے ہلکی دھات ہے، اس لئے عام طور پر ہوائی جہازوں کی ساخت میں کام آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے "سونے" کا ماننا درحقیقت سونے کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ اس طرح اس خدا کا ماننا جس کی صفات، حقیقی خدا کی نہ ہوں، خدا کا اقرار نہیں، اس کا انکار ہے۔

قرآنی ایمان کی خصوصیات

نہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا، بلکہ خدا اور انسان کا جو تعلق قرآن بتاتا ہے، اس کا تصور بھی کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ

(۱) تمام کائنات پر خدا کا اقتدار و اختیار ہے لیکن وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق استعمال کرتا ہے اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر، یہ تمام سلسلۂ کائنات سگے بندھے قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے جو محکم اور اٹل ہیں۔ یہی قوانین خود انسانوں کی دنیا میں بھی کارفرما ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اس میں کبھی استثنا نہیں ہوتی۔ ہر انسان کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جو عمل چاہے کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ عمل تو ایک قسم کا کرے اور اس کا نتیجہ دوسری قسم کا پیدا کرلے۔ جس قسم کا عمل ہوگا اسی قسم کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ یہ نتائج خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

(۲) بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتہً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے (مثلاً یہ کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا نہ ہی وہ عدم سے وجود میں آیا ہے) انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفاتِ ذاتِ خداوندی کی ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات، محدود اور سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔ نیز قابلِ نشوونما (Un-Developed)۔ ان کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انسان، صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے۔ جس چیز کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کہتے ہیں وہ (معاذ اللہ) کسی مستبد، مطلق العنان، ڈکٹیٹر کے احکام کی فرماں پذیری نہیں ہوتی بلکہ ان ہدایات (Directions) کا اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

ان ہدایات کے اتباع سے اس ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ہم خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا ذکر کرتے ہیں تو وہ (جو ہماری ذات میں ہوتی ہیں اور محدود شکل میں) گویا خود ہماری ذات کی صفات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ (۲۱/۱۰ و دیگر مقامات)۔ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے (ذکر کے معنی عظمت و شرف بھی ہیں اور تذکرہ بھی) اقبالؒ کے الفاظ میں

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

(۳) جوں جوں انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی جاتی ہے، وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں خدا بہرحال رفیقِ اعلیٰ ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کا یہ تعلق قرآن کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گا۔ مشرق کے اہلِ مذاہب کے ہاں خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ انسان خدا کی پرستش کرتا ہے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے جسے انسان کو طوعاً وکرہاً ماننا ہے۔ اگر کوئی اس کا حکم نہ مانے تو خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ اسے راضی کرنے کے لئے اس کے حضور نذر نیاز گزارنا یا اس کے کسی "مقرب" کی وساطت سے اس تک سفارش پہنچانا ضروری ہے۔ جب وہ اس طرح خوش ہو جاتا ہے تو انسان کی مرادیں بر آتی ہیں یا وہ ناراض رہتا ہے تو انسان مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔

اس کے برعکس، مغرب کے اربابِ فکر و نظر کے نزدیک، خدا کا تعلق صرف خارجی کائنات سے ہے جس میں اس کے قوانین (قوانینِ فطرت کی شکل میں) کارفرما ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائے۔ باقی رہی انسانی دنیا، سو اس میں انسانوں کو اپنے معاملات اپنی عقل و فہم کی رو سے طے کرنے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی غیر متبدل اصول اور قوانین نہیں ہیں۔

اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ دنیا کے "خدا پرستوں" کے متعلق بھی قرآن کا یہ ارشاد کیوں ہے کہ فَاِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷)۔ "اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو۔ تب سمجھے کہ انہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا"۔ اگر یہ اس طرح ایمان نہ لائیں اور اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مانتے رہیں، تو خدا کے رجسٹر میں ان کا شمار "اللہ کو ماننے والوں" میں نہیں ہوگا۔ یعنی قرآن کی رو سے اسے ایمان باللہ نہیں کہا جائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے صفاتِ الٰہیہ کا ذکر اس قدر وضاحت اور تکرار سے کیوں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں)، دین کا مدار ہی صفاتِ خداوندی کے صحیح اور غیر مبہم تصور پر ہے۔

اسماء الحسنیٰ

قرآن نے صفات خداوندی کا عمومی ذکر ہی نہیں کیا بلکہ انھیں اسماء الحسنیٰ کہہ کر ایک اور حقیقت کی طرف بھی توجہ منعطف کرائی ہے۔ حسنیٰ، حُسن سے ہے اور حُسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حُسن باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے تو مورخین نے کہا ہے کہ "اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا"۔ اسماء الحسنیٰ کے معنی ہیں کہ خدا کی یہ صفات جہاں مکمل ترین اور اعلیٰ ترین ہیں وہاں ان میں انتہائی تناسب بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفات وخصائص سے صحیح (اور تعمیری) نتائج اسی صورت میں مرتب ہوسکتے ہیں جب ان صفات وخصائص میں صحیح صحیح تناسب و توازن ہو۔ کوئی نسخہ کارگر نہیں ہوسکتا جب تک اس کی ادویات کے اوزان میں صحیح تناسب نہ ہو۔ اسی تصور کو ذرا آگے بڑھائیے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ (مثلاً) پانی حیات بخش ہے لیکن صرف اسی صورت میں جب جسم انسانی میں اس کا تناسب صحیح ہو۔ اگر اس تناسب میں ذراسی بھی کمی بیشی واقع ہوجائے تو ان کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ صرف صحت ہی نہیں بگڑتی بلکہ اگر اس کی افراط حد سے بڑھ جائے (جیسے ڈوبنے میں ہوتا ہے) تو اس سے فوری موت واقع ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف سنکھیا سم قاتل ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح مقدار میں دیا جائے تو ممدِ حیات اور قوت افزا ہوجاتا ہے۔ عالمِ طبعی سے ہٹ کر اخلاقیات کی طرف آئیے تو اس میں بھی یہی حقیقت کارفرما نظر آتی ہے (مثلاً) شرافت ایک عمدہ جوہر ہے لیکن یہ ذرا اپنی حد سے بڑھ جائے تو بے غیرتی بن جاتی ہے۔ عفو ودرگذر اپنی حد کے اندر عمدہ خصلت ہے لیکن ذرا تفریط میں پہنچے تو بزدلی سے تعبیر ہوجاتی ہے۔ دولت خرچ کرنا زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن یہ ذرا افراط کی طرف چلی جائے تو اسراف ہوجاتا ہے اور تفریط کی طرف نکل جائے تو بخل بن جاتا ہے۔ لہٰذا صفات وخصائص اسی صورت میں خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں جب ان کا تناسب صحیح ہو۔ بالفاظِ دیگر صحیح نتائج مرتب کرنے کے لئے اسماء کا حسنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔

جس طرح ذاتِ خداوندی میں اسماء حسنیٰ ہیں۔ اسی طرح جب انسانی ذات میں نشو ونما ہو تو اس کی صفات کے لئے بھی حسنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کی ساری تعلیم اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس میں وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ کس موقع پر کس صفت کا ظہور ہونا چاہیئے اور یہ ظہور کس حد کے اندر ہونا چاہیئے۔ خدا زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی (هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۔۔)۔ وہ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۔۔) سخت سزا دینے والا بھی ہے اور التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۔۔) رحمتوں کے ساتھ لوٹ آنے والا) بھی۔ سطح بین نگاہوں کو ان صفات میں تضاد نظر آتا ہے لیکن جو دیدہ ور، سطح سے نیچے اُتر کر حقیقت کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے، وہ علیٰ وجہ البصیرت پورے تحکم ویقین سے کہہ سکتا ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کوئی تضاد نہیں کہ پانی زندگی بخش بھی ہے اور قاطع حیات بھی۔ یہ نگاہوں کی سطح بینی تھی جس کی وجہ سے

بظاہر متضاد صفات

عیسائیت نے یہ کہہ دیا کہ خدا رحم ہی رحم ہے (God is Mercy)۔ اور نجات صرف اس کے فضل (Grace) سے ہوتی ہے۔ اعمال سے نہیں

اور دوسری طرف ہندومت کے "کرم یوگ" کے فلسفہ نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ غلط کام (جو ایک مرتبہ سرزد ہو جائے) اس کی ہلاکت آفرینی سے کسی صورت میں مفر نہیں (تناسخ یا آواگون کا نظریہ اسی مفروضہ پر قائم ہے)۔ قرآن نے ان دونوں نظریات کے برعکس یہ بتایا کہ (مثلاً)

(۱) سنکھیا اگر مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو مفید ہوتا ہے۔

(۲) اگر وہ تناسب سے تھوڑا سا آگے بڑھ جائے تو اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

(۳) اور اگر وہ ایک حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے تو مہلک ہو جاتا ہے۔

نمبر ۳ وہ مقام ہے جہاں قانون مکافات کو شَدِیْدُ الْعَذَابِ کہا جائے گا یعنی ہلاکت آفریں نتائج کا حامل لیکن نمبر ۲ کے متعلق ظاہر ہے کہ مناسب تدابیر سے سنکھیا کے مضر اثرات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے تَوَّابِیَّت کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) اعمالِ حسنہ اعمالِ سیئہ کے مضر اثرات کو دور کر دیتے ہیں۔ اسی کو عفو کہتے ہیں۔

ان امور کا صحیح مقام تو آگے چل کر آئے گا جہاں خدا کی گوناگوں صفات کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔ اس مقام پر ہم نے اجمالی طور پر اس کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا کہ یہ حقیقت سامنے آ جائے کہ

(الف) ذاتِ خداوندی کی بظاہر متضاد صفات کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

(ب) اسماء کے حسنیٰ ہونے کی اہمیت کیا ہے۔ اور

(ج) انہی صفات کا جب انسانی معاشرہ میں ظہور و نفوذ ہو گا تو ان میں ضروری تناسب و توازن کا قائم رکھنا کس قدر لاینفک ہو گا۔

صفاتِ خداوندی کے ضمن میں یہ چیزیں بھی قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملیں گی۔ اس سے آگے چل کر یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ ان تفصیلات سے اخلاقی اقدار (Ethical values) کا تعین کس حسن و خوبی سے ہو جاتا ہے اور خیر و شر کی وہ کشمکش کس آسانی سے رفع ہو جاتی ہے جس نے دنیائے فکر کو شروع سے آج تک طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ (اس نقطہ کے متعلق مزید بحث ذرا آگے چل کر آئے گی)

٭٭٭

خدا کی لامحدود صفات

اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ خدا کی بعض صفات ایسی ہیں، جن کا صحیح تعین (ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کی طرح) ہماری سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (۵۷/۳) "وہ الاول اور الآخر ہے" ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ کسی ایسے زمان (Time) کا تصور جس کی ابتدا کہیں سے نہ ہو، ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ نہ ہی ایسے زمان کا تصور جس کی انتہا

کوئی نہ ہو۔ جب ہم خدا کے متعلق کہتے ہیں۔ هُوَ الْأَوَّلُ۔ تو ہم اس کی لامتناہیت کا صحیح صحیح تصور کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارا ذہن اس کا آغاز کسی نہ کسی نقطہ سے ضرور کرے گا۔ اسی طرح جب ہم اس کے متعلق کہتے ہیں هُوَ الْآخِرُ تو ہمارا ذہن اس کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ وہ کسی نہ کسی نقطہ پر جا کر ضرور رک جائے گا۔ لہٰذا ہم خدا کے اول اور آخر ہونے کا حقیقی اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ کچھ نہ ہوگا تو خدا ہوگا

قرآن، اس سے زیادہ کا ہم سے مطالبہ بھی نہیں کرتا۔

اس قسم کی معدودے چند صفات کو چھوڑ کر، خدا کی باقی صفات ایسی ہیں جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں اخلاقی صفات (Ethical Attributes) کہتے ہیں۔ مثلاً ربوبیت۔ رزاقیت۔ رحمانیت وغیرہ۔ یہی وہ صفات

مستقل اقدار

ہیں جنہیں مستقل اقدار (permanent values) کہا جاتا ہے قرآنی نظامِ زندگی میں ان اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس نظام (الدین) کی ساری عمارت انہی بنیادوں پر استوار ہے۔

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے لئے مستقل اقدار کی ضرورت کیا ہے۔ اسے اپنے معاملات عقل و فکر کی رو سے طے کر لینے چاہئیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیت عطا کی گئی ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس سے یہ دیگر حیوانات سے متمیز ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن عقل و فکر اور علم و بصیرت پر بڑا زور دیتا ہے۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اس کے نزدیک شَرَّ الدَّوَابِّ (۸/۲۲) اور اہلِ جہنم (۷/۱۷۹) ہیں۔ علم و عقل کی رو سے انسان اشیائے کائنات کا مطالعہ کر کے فطرت کی مخفی قوتوں کو مسخر کرتا اور اس طرح مسجودِ ملائکہ بنتا ہے۔

لیکن جہاں خارجی کائنات میں انسانی عقل اس قدر نفع رساں اور حسین نتائج کی حامل بنتی ہے جب یہی عقل

عقول کی جنگ

خود انسانی دنیا میں آتی ہے تو یہاں یہ عجیب گل کھلاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب تک معاملہ قوائے فطرت کی تسخیر تک رہتا ہے، انسانی عقل بلا تصادم و تزاحم کام کئے جاتی ہے۔ لیکن جونہی ان قوتوں کے استعمال کا سوال آتا ہے، یہی عقل انسانوں کی باہمی کشمکش اور فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ مثلاً ایٹمی قوت کی ریسرچ میں دنیا بھر کے سائنسدان اپنی اپنی لیبارٹریز میں نہایت امن و سکون سے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ لیکن جب ایٹم بم تیار ہو جاتا ہے تو اس کے استعمال پر اقوامِ عالم میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور یہی جھگڑے آخر الامر جنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں فطرت کی یہی قوتیں جنہیں وجہ تعمیرِ انسانیت ہونا تھا، باعثِ تخریبِ آدمیت بن جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل کا تقاضا ہے کہ وہ اس فرد، اس گروہ اور اس قوم کے مفاد کا تحفظ کرے۔ اسے کسی اور فرد۔ گروہ یا قوم کے مفاد کے تحفظ سے سروکار نہیں ہوتا۔ یعنی عقل انسانی، سودِ خویش ہی

جاتی ہے۔ بہبودِ غیر سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بنا بریں مختلف افراد یا اقوام کے مفاد میں تصادم (Clash of interests) ہوتا ہے تو ان کی عقلوں میں جنگ (Battle of Wits) شروع ہوجاتی ہے۔ اسے بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے جذبات انسان کی حیوانی جبلت (Animal instinct) کے اندر داخل ہیں۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کے تقاضوں کو پورا کرے۔ مثلاً کسی شخص کے ہاں ایک خوبصورت تصویر ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اسے حاصل کرلیں۔ (یہ ہمارے جذبات کا تقاضا ہے)۔ وہ شخص اس تصویر کو دینا نہیں چاہتا۔ (یہاں سے ہمارے جذبات میں تصادم شروع ہوتا ہے)۔ اب ہماری عقل آگے بڑھتی ہے اور ہمیں مختلف تدبیریں سُجھاتی ہے کہ اس تصویر کو کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کے برعکس، فریقِ مقابل کی عقل اسے یہ بتاتی ہے کہ اس تصویر کی حفاظت کے لئے کیا کیا تراکیب اختیار کی جائیں۔ (اسے عقلوں کی جنگ کہہ لیجئے)۔ اب ظاہر ہے کہ جس کی عقل زیادہ تیز ہوگی وہی کامیاب ہوجائے گا۔ اس کے بعد فریقِ ثانی اس سے بدلہ لینے کے درپے ہوگا۔ اس کا نام فساد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی عقل، اُس کے جذبات کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اسی طرح جس طرح "کُتّے کے پاؤں اُس کی ناک (شکار کی بُو) کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں"[1]۔

ان تصادمات کے انسداد یا ازالہ کے لئے انسانی معاشرہ کچھ اصول وضع کردیتا ہے جو اس معاشرہ میں رہنے والے تمام افراد پر یکساں طور پر جاری ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو قوانین کہا جاتا ہے۔ اس کے

قوانین کے ذریعے فیصلہ

معنی یہ ہیں کہ اس معاشرہ کے مختلف افراد اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ متنازعہ فیہ معاملات میں، اپنے اپنے جذبات کے تابع اور اپنی اپنی عقل کے پیچھے چلنے کے بجائے، ان تسلیم کردہ اصولوں کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ جو شخص ان کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، معاشرہ اُسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ان کے مطابق چلے۔ ظاہر ہے کہ ان اصولوں (قوانین) کو انسان کی تمدنی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ (۱) ان اصولوں کے وضع کرنے میں کسی خاص فرد، خاص پارٹی یا خاص قوم کے جذبات کو کوئی دخل نہ ہو۔ اور (۲) یہ اصول ایسے نہ ہوں کہ انہیں جب جی چاہے بدل لیا جائے قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے اصول وضع کرنا عقلِ انسانی

غیر متبدل قوانین

کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ (انسانی معاملات میں) اس کی عقل، جذبات سے خالی ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا، یہ اصول ایسے مقام سے ملنے چاہئیں جو انسانی جذبات سے بلند ہو اور جس کے نزدیک تمام انسان (کسی ایک ملک یا ایک دور کے انسان نہیں، بلکہ تمام انسان) برابر ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا مقام، ذاتِ خداوندی کے سوا اور کوئی نہیں

---

[1] اس مقام پر صرف انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی میری دوسری تصانیف "ابلیس و آدم" اور "انسان نے کیا سوچا؟" میں ملے گی۔

ہو سکتا۔

مستقل اقدار وہ ناقابلِ تغیر و تبدل اصول ہیں جو خدا کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے دیئے ہیں تاکہ یہ اپنے فیصلے ان کے مطابق کریں۔ انسانی معاشرہ ان اصولوں کی عملی تنفیذ کے لئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ضمنی قواعد و ضوابط مرتب کرے گا لیکن ان اصولوں میں کسی قسم کے تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کا جواز نہیں ہوگا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار، صفاتِ خداوندی ہیں جنہیں (سمجھنے کی غرض سے) "اخلاقی صفات" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اس قسم کے غیر متبدل اصول (مستقل اقدار) وضع کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان اصولوں کا سمجھنا اور سمجھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ یہ فی الواقعہ اپنے دعوے میں سچے، اور اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں، بھی عقل کی حد سے باہر ہے۔ قطعاً نہیں۔ عقل انہیں سمجھ سکتی ہے لیکن اس کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح ایک سائنٹسٹ خارجی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ

قرآنی اصولوں کا سمجھنا

عقل و بصیرت کی رُو سے معروضی طور پر (objectively) کرتا ہے اور اس پر اپنے جذبات و عواطف کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا، اگر اسی طرح قرآنی اصولوں پر غور و فکر کیا جائے تو ان کی صداقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن نے اپنے دعاوی کی صداقت کے پرکھنے کا طریق خود ہی بتا دیا ہے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۔ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۔ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (۱۰/۳۹) پہلی بات اس میں یہ کہی گئی ہے کہ قرآنی دعاوی کی تکذیب وہ لوگ کرتے ہیں جو علمی طور پر اس کے حقائق کا احاطہ نہیں کرتے۔ (لَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا ۲۷/۸۴)۔ یعنی قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس سطح تک علمِ انسانی اس خاص زمانے تک پہنچ چکا ہے وہ علمی سطح انسان کے سامنے رہے۔ "اس زمانے کی سطح تک" اس لئے کہا گیا ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے، قرآنی حقائق اسی نسبت سے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری بات اس نے یہ کہی ہے قرآنی حقائق پر غور کرنے والے مفکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخِ عالم کا مطالعہ کرے اور اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف کو سامنے لائے۔ وہ دیکھ لے گا کہ جس قوم نے قرآنی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کی اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے اس کی خلاف ورزی کی، اُس کے عواقب کیا ہوئے۔ قرآن نے اسی مقصد کے لئے تاریخ کے مطالعہ پر بار بار زور دیا ہے۔

اور تیسرا طریق یہ کہ قرآنی اصولوں کے مطابق معاشرہ متشکل ہونے دیا جائے۔ معاشرہ کے نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ یہ اصول حق و صداقت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ اسے استنتاجی طریق یا (Pragmatic Test) کہتے ہیں۔

جب قرآنی حقائق پر اس انداز سے غور و فکر کیا جائے تو ان کی صداقتیں ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، شرط یہ ہے کہ اس غور و فکر کو جذبات سے ملوث نہ ہونے دیا جائے۔ جب تک انسانی جذبات کو وحی کی راہ نمائی کے تابع نہ رکھا جائے حقیقت کبھی سامنے نہیں آ سکتی۔ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہوگا جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر، اپنے جذبات کی اتباع کئے جاتا ہے۔

خیر و شر کا مسئلہ

بہر حال یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ وہ مستقل اقدار یا غیر متبدل اصول جن کے مطابق انسانی معاشرہ کو متشکل ہونا چاہیئے، صفاتِ خداوندی ہی پر متفرع ہیں۔ اس سے بھی اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ صفاتِ خداوندی کے صحیح ہونے کی اہمیت کیا ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ صفاتِ خداوندی کے صحیح تصور اور ان کے اسماء الحسنیٰ ہونے کے قرآنی مفہوم سے خیر و شر (Good and Evil) کا پیچیدہ ترین مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو کام انسانی ذات کی نشو و نما، تقویت اور استحکام (Integration) کا موجب ہو، عمل خیر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی اعمال ہو سکتے ہیں کہ جو مستقل اقدار، یا صفاتِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ اور جو عمل، انسانی ذات میں ضعف اور انتشار (Disintegration) پیدا کر دے وہ شر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی اعمال ہو سکتے ہیں جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں۔ دنیا میں خیر و شر کا یہی معیار ہے۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صفاتِ خداوندی کا انسانی ذات سے کیا تعلق ہے اور ان کی اہمیت کیا ہے۔

صفاتِ خداوندی کی ہمہ گیری

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خارجی کائنات کا کوئی گوشہ اور انسانی دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو صفاتِ خداوندی سے غیر متعلق ہو۔ انسانی دنیا میں، ایک فرد کی انفرادی زندگی ہو یا ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ، سب کی صحیح تشکیل و تکمیل، صفاتِ خداوندی کے قالب (Pattern) میں ڈھلتی ہے۔ یہ صفات فرد کی ذات کی نشو و نما کے لئے معیارِ اعلیٰ بنتی ہیں اور انہی سے وہ غیر متبدل اصول متشکل ہوتے ہیں جن کے مطابق چلنے سے انسانی معاشرہ فردوس بداماں ہو جاتا ہے۔ انہی سے انسان کے حال کی سرفرازیاں وابستہ ہیں اور انہی سے اس کے مستقبل کی سربلندیاں منسلک۔ ان سے الگ رہ کر زندگی کبھی انسانی سطح پر نہیں رہ سکتی۔ حیوانی (بلکہ اس سے بھی اسفل) سطح پر رکی رہتی ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی میں صفاتِ خداوندی کے صحیح علم و تصور کی اہمیت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن نے ایمان باللہ پر اس قدر زور دیا ہے (ایمان باللہ کے معنی ہی صفاتِ خداوندی پر یقینِ محکم کے ہیں)۔ یہی وہ اساس ہے جس پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی وہ بیج ہے جس سے اعمالِ حسنہ کا شجرِ طیب ثمربار ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لہٰذا ایمان باللہ ہی وہ محور ہے جس کے گرد ان کی تمام کائنات گردش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس وضاحت و صراحت اور تفصیل و تشریح سے بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ چیز دنیا کے مذاہب و افکار میں اور کہیں نہیں ملتی اس لئے قرآن کی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے۔ اور چونکہ اس میں ان صفات کا مکمل تصور دے دیا گیا ہے اس لئے اس کے بعد کسی کتاب (فلہٰذا کسی نبی یا رسول) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آئندہ صفحات میں انہی صفاتِ خداوندی کا قرآنی بیان آپ کے سامنے آئے گا۔

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالکِ اسلامیہ کے بلند پایہ مفکرین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔

یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے

قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام 25/B گلبرگ کالونی۔ لاہور

شعلۂ مستور

حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت۔ ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ پیشوائیت۔ غرضیکہ ہر نوع کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتی تھی۔ وہ باطل کے ان خرمنوں پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور انھیں خس و خاشاک بنا کر رکھ دیتی۔

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی لیکن انسانی تحریف نے آپ کو ایک فقیر بے نوا کی حیثیت دیدی جس کی پکار یہ ہو کہ کسی طاغوتی قوت کا مقابلہ مت کرو اور جو رہزن تمہارا کوٹ اتار لے اسے اپنی واسکٹ خود اتار کر دیدو۔

محترم پرویز صاحب کی تحقیق نے، قرآن اور تاریخ کی روشنی میں، انسانی تحریک کے ان تمام پردوں کو چاک کر کے جناب مسیحؑ کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس میں آپ کی پیدائش۔ ابتدائی زندگی۔ دعوت آپ کے خلاف سازش۔ ہجرت۔ وغیرہ کے واقعات کے علاوہ، عیسائیت کے غلط عقائد۔ الوہیت۔ تثلیث کفارہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آخر میں تمام انبیائے سابقہ اور امم گذشتہ کے احوال و ظروف پر نگاہِ بازگشت ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب معارف القرآن جلد سوم کے متعلقہ حصّہ کا جدید ایڈیشن ہے جسے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت قریب پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد -/5/8 روپے

نوٹ:۔ پیشگی خریداران میں سے جو حضرات کتاب منگانا چاہیں وہ ۱۵ اگست تک مطلع فرمادیں۔ بصورتِ دیگر کتاب ارسال خدمت کر دی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام 25/B گلبرگ کالونی۔ لاہور

چند بصیرت افروز کتابیں

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑا سائز ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

اسباب زوال امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری شکست و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا ہے ۱۰۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

اسلامی معاشرت (تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات۔ بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ قیمت دو روپے۔

اقبال اور قرآن علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ۲۰۶ صفحات قیمت دو روپے۔

جشن نامے ہم ہر سال جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی مبتسم نشاں درد انگیز تصویر ۲۰۶ صفحات قیمت دو روپے

مزاج شناس رسول پیشوایان ملوکیت کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیئے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت چار روپے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے۔

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اس کے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

اس پتہ سے منگوائیے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ کالونی۔ لاہور

دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں

(مولانا) محمد حنیف ندوی علمی اور مذہبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ آجکل ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور) سے بحیثیت رکن متمسک ہیں لیکن مسلک کے اعتبار سے اہلِ حدیث ہیں اور اس پایہ کے اہلِ حدیث کہ وہ جمعیۃ اہلِ حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ پچھلے دنوں جب جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان "منہاج" کا اجراء ہوا ہے تو اس میں آپ نے اہلِ قرآن کے مسلک کے خلاف (غالباً اہلِ حدیث کے مشرب کے حق میں) طویل مقالہ لکھا تھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ (یہ بدقسمتی سے یا جیسا کہ آجکل فیشن سا ہو چکا ہے، اس مقالہ میں پرویز صاحب کو بھی فرقۂ اہلِ قرآن سے متعلق قرار دیکر ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا حالانکہ اُن کا اس فرقہ (یا کسی اور فرقہ) سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ جداگانہ داستان ہے)۔ جہاں تک قرآن و حدیث کا تعلق ہے، اہلِ حدیث کا (مختصر الفاظ میں) مسلک یہ ہے کہ

(۱) نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے قرآن اور حدیث دونوں وحی کے ذریعے ملے۔ حضرت جبرئیلؑ حدیث لے کر بھی اسی طرح نازل ہوا کرتے تھے جس طرح قرآن لے کر نازل ہوتے تھے۔ لہٰذا

(۲) قرآن اور حدیث میں تعلقاً کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ دونوں کے احکام ابدی اور غیر متبدل ہیں اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ اپنے اجتہاد سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔

اس کے برعکس، طلوعِ اسلام کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ

(۱) نبی اکرمؐ کو قرآن کریم بذریعہ وحی عطا ہوا تھا۔ قرآن میں کچھ احکام مصرح ہیں اور باقی بطور اصول قوانین دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے مصرح احکام ہوں یا اصولی قوانین، یہ سب ابدی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

(۲) قرآن کریم کے اصولی قوانین کی جزئیات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اسلامی نظام متعین کرتا ہے۔ انہیں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے صحابہ کبارؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔ حضورؐ کے بعد یہ فریضہ خلافتِ راشدہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد جب بھی خلافت علیٰ منہاج رسالت قائم ہوگی اسے اس کا حق ہوگا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق،

عندالضرورت ان جزئیات میں تبدیلی کر دے یا نئی نئی جزئیات متعین کرلے۔ اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے علاوہ کسی کو انفرادی طور پر اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے اجتہاد سے ان میں تبدیلی کر سکے۔

محترم ندوی صاحب کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ وہ جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ اس لئے ان کا مسلک واضح اور ظاہر ہے۔ لیکن حال ہی میں عنوان بالا سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے (جو پہلے امروز میں چھپا تھا اور اس کے بعد ماہنامہ ثقافت (لاہور) کی جون ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں)، اس مقالہ میں انھوں نے

(۱) بہ ہیئت مجموعی جو کچھ لکھا ہے وہ مسلک اہل حدیث کے یکسر خلاف ہے۔

(۲) بیشتر وہ کچھ لکھا ہے جسے ایک عرصہ سے طلوع اسلام پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ اور

(۳) کچھ باتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو نہ صرف طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف ہیں بلکہ ہمارے نزدیک خود دین کی اصل و بنیاد کے بھی خلاف ہیں۔

ہم ذیل میں محترم ندوی صاحب کا مقالہ درج کرتے ہیں۔ اس کے جن حصوں سے ہمیں اختلاف ہے ان پر نمبر دیدیئے گئے ہیں مقالہ کے اختتام پر انہی نمبروں کی ترتیب سے ہم اپنا تبصرہ پیش کریں گے تاکہ متعلقہ نقاط کے دونوں گوشے قارئین کے سامنے آسکیں۔ سب سے پہلے آپ ندوی صاحب کا مضمون ملاحظہ کیجئے۔ عنوان ہے

دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں

اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ کارگاہ حیات، یہ عالم رنگ و بو اور یہ چمنستان دہر سراسر اللہ تعالیٰ کے علم و تدبیر کا نتیجہ اور اس کی خلاقیوں کا رہین منت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس کی تخلیق و آفرینش کے پہلو بہ پہلو انسانی ذوق و بصیرت کی نادرہ کاریاں نہ ہوتیں، یعنی انسان اگر فطرت کے سادہ خاکوں میں رنگ نہ بھرتا تو اس کی تکمیل و ترقی میں جان فشانی اور ہنرمندی کا ثبوت نہ دیتا تو آج تہذیب و تمدن کی جو گہما گہمی اور رونق دکھائی دیتی ہے اس کا وجود تک نہ ہوتا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ قدرت (فطرت) اگر اشیاء کو خلعت وجود بخشتی اور پیدا کرتی ہے تو حضرت انسان کی خدمات بھی کم اہم نہیں۔ یہ ان اشیا سے حیرت انگیز کام لیتا ہے۔ انھیں سنوارتا اور چمکاتا ہے نظم و ترتیب کی رنگا رنگی سے عجیب و غریب صورتیں پیدا کرتا ہے اور یہی وہ گونا گوں کوششیں اور فطرت انسان کی سازگاریاں (1) (2) ہیں جن سے بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن معرض ظہور میں آئے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم کہیں کہ گیسوئے قدرت کبھی انسانی ذوق جمال و آرائش کی منت پذیریوں سے آزاد نہیں ہوا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ مذہب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں بھی فیضان وحی و الہام کے ساتھ ساتھ انسان کی تعبیر و ترجمانی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ویدوں کو اگر اپنشدوں کے مصنفین تصوف و فلسفہ کے سانچوں میں نہ ڈھالتے، یہودیت کو اگر فلو ایسا حکیم و دانشور میسر نہ آتا اور عیسائیت کو ایکوناس اور آگسٹن ایسے مفکر اگر معقول رنگ میں پیش نہ کرتے تو ان مذاہب میں کوئی کشش اور جاذبیت نہ

پائی جاتی اور استفادہ و ایمان کا وسیع حلقہ صرف چند نفوس ہی تک سمٹ کر رہ جاتا۔ خود اسلام کے بارے میں ہمارا
(۲) یہی عقیدہ ہے۔ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اس کو صرف وحی و الہام اور الفاظ و نصوص کی حد تک محدود سمجھتے ہیں بلکہ
نزدیک اس میں ذوقِ نبوت کی جمال آرائیوں کو بھی دخل ہے اور آنحضرتؐ کے اپنے اجتہاد و بصیرت کا بھی حصہ ہے۔ یہی نہیں،
نقطۂ نظر اس سے بھی وسعت و کشائش کا طالب ہے۔

آنحضرتؐ کا اجتہاد

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و سنت کے گل و ریحان کی چمن بندی میں کس کس کا ہاتھ ہے؟ کیا
(۳) یہ واقعہ نہیں کہ فقہائے عظام کی موشگافیوں نے اس کے جملہ اطلاقات کو ایک نظامِ عمل کی
شکل میں مدون کیا۔ متکلمینِ اسلام اور حکماء نے اس کے عقلی و فکری مقام کی وضاحت کی۔ اور صوفیاء و شعراء نے اس کے
حکیمانہ لطائف کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور ان سب کی یہ کوششیں اسلام کی بہترین میراث اور نہایت ہی
قیمتی ذخیرہ ہیں جن سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیازی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

غرض یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کی تشریح و فہم کے پیمانوں کا تعلق ہے اور جہاں تک نفسِ اجتہاد و بصیرت کی
کارفرمائیوں کا سوال ہے، ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی وہی حیثیت ہے جو حکومت کے عام مظاہر سے
متعلق انسانی عقل و دانش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم مسئلہ اجتہاد پر بحث کرتے ہیں تو اس کو اسلام سے الگ کوئی
بیرونی و اجنبی چیز نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو اسلام ہی کا ایک داخلی اور ضروری تقاضا خیال کرتے ہیں، اور اس کا آغاز
ائمۂ مجتہدین کے بجائے آنحضرتؐ سے کرتے ہیں۔ اجتہاد نے وحی و الہام کے پہلو بہ پہلو دین کی تشکیل میں حصہ لیا ہے
اور قرآن کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کے مجتہدات نے بھی بہت سی مشکلات کو سلجھایا ہے۔ یہ ایسا دعویٰ ہے جس کی
(۴) تائید کے لئے ہمیں عہدِ نبوی کے چند مظاہر کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے قرآن کی ترتیبِ سورہ کا مسئلہ ہی
لیجئے کہ اس باب میں کوئی نص موجود نہیں لیکن آنحضرتؐ نے اس کے باوجود محض اپنے ذوقِ اجتہاد کے بل پر ان میں
ترتیب و نظام قائم رکھنے کی تلقین فرمائی۔ جب نمازیں فرض قرار پائیں تو سوال یہ تھا کہ قبلہ کونسا ہو۔ آنحضرت
صلعم نے فیصلہ کیا کہ بیت المقدس کو سرِدست مرکزِ توجہ ٹھیرا لیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سولہ سترہ ماہ تک
مسلمان اُدھر رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے۔ پھر جب کعبہ کو اس کے بجائے قبلہ مقرر کیا گیا تو اس کے لئے بھی طلب
و آرزو کے داعی آنحضرتؐ کے قلبِ اقدس ہی میں اُبھرے۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ (الآیہ) اس آیت میں قبلۃً ترضٰها کے الفاظ خصوصیت
سے قابلِ لحاظ ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی رضا بھی مطلوب دین ہے۔ مگر یہ رضا کیا ہے؟ کیا آنحضرتؐ
کی کوئی نفسی خواہش؟ کوئی دنیوی یا مادی آرزو اور طلب؟ نہیں۔ ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ "رضا" جس کو اللہ تعالیٰ
نے اس درجہ در خورِ اعتنا سمجھا ہے، اجتہاد و بصیرتِ نبویؐ کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

یہی نہیں، پورا دین۔ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور معاشرتی زندگی کا وہ تفصیلی نقشہ جو قرآن میں موجود نہیں ہے آنحضرتؐ کا اجتہاد ہی تو ہے جس نے اس وجہ سے شریعت کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ آنحضرتؐ کے مجتہدات تشریعی کو ماننے کے ہم ہر حال مکلف ہیں۔ اس لئے مکلف ہیں کہ ان مجتہدات میں اگرچہ سہو و غلطی کا اسی طرح امکان پایا جاتا ہے جس طرح کہ عام مجتہدین کے نتائج فکر میں۔ مگر وحی و الہام کی نگرانی چونکہ اس سہو و غلطی کو قائم نہیں رہنے دیتی ۵
اور عنایت الٰہی اور فیضان ربوبیت چونکہ آنحضرتؐ کے فہم و فکر کی استواریوں کا بہترین اور کامیاب ضامن و کفیل ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کا اجتہاد محض ایک مجتہد اور فقیہ کا اجتہاد نہ رہے بلکہ شریعت و دین کا ایک تقاضا اور جزو ہو اور اس لائق ہو کہ اس کو مانا جائے اور تسلیم کیا جائے۔

نبوت کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کی مجتہدانہ حیثیت بھی برقرار رہتی ہے۔ یا واضح تر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اجتہاد بھی دائرۂ نبوت اور منصب نبوت کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس پر اصولیوں نے کھل کر بحث کی ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض، ابن خلدون، ابن ہمام اور قرآن کی تصریحات اس باب میں شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مسئلہ زیر بحث کی اس تصریح سے ہمیں دو باتوں کی طرف خصوصیت سے اشارہ کرنا مقصود ہے ایک یہ کہ اجتہاد چونکہ ایک جانا بوجھا اسلامی تقاضا ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کی اجازت ہے یا نہیں یا یہ کہ اس کے دروازے کسی دور میں بھی اُمت پر بند رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وحی و الہام کے یہ معنی قطعی نہیں ہیں کہ فکر و ۶
اجتہاد کی تگ و تاز پر پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں یا یہ کہ علم و ادراک کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی حقیقی منافات پائی جاتی ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہم یہ کہیں گے کہ ہمارے نزدیک جس طرح ایک اچھا اور کامیاب اور سیاسی نظام وہ ہے جس میں ہر کوئی شریک ہو، جس میں کسی فریق یا گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہ کی گئی ہو اور جو اس لائق ہو کہ ہمیشہ فکر و عقل تجربات کی روشنی میں اس میں مناسب رد و بدل کر سکیں۔ ٹھیک اسی طرح صحیح، قابلِ عمل اور ترقی پذیر مذہب وہ ہو سکتا ہے جس میں بنیادی اور اساسی تعلیمات کے سوا عملی جزئیات اور معاشرتی فروع میں اہلِ علم اور دانشوروں کو تشریح و ترجمانی کی پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ تاکہ نہ تو معاشرہ کی تیز رفتاریوں میں فرق آئے اور نہ ایسا ہو کہ مذہب و دین و رہنمائی کا فریضہ انجام دینے سے قاصر رہے۔ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کم از کم اس معیار پر پورا اُترتا ہے۔

دو بنیادی نکات

مسئلہ اجتہاد کے سلسلے میں دراصل قابلِ غور دو نکتے ہیں:۔
اوّلاً اجتہاد و استنباطِ مسائل کے شرائط کیا ہیں؟
ثانیاً۔ کیا اس کے حدود بنیادی تبدیلیوں تک وسیع مانے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے افکار کو انہی دو نکتوں تک محدود رکھیں گے جہاں تک شرائط اجتہاد کا تعلق ہے اس پر دو پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ منصب اجتہاد کن کن علمی و

دخلی خوبیوں کا متقاضی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر حکومت و تقنین کے دائرے الگ الگ نہ ہوں اور ایک ہی ادارہ ایسا پایا جائے جو برسر اقتدار بھی ہو اور یہ بھی چاہتا ہو کہ قانون کو اسلامی سانچوں میں ڈھالا جائے تو اس صورت میں اجتہاد و قیاس کی مشینری کو کیونکر بروئے کار لایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں پہلو بالکل مختلف ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں ملوکیت و شخصی حکومتوں کا دور دورہ رہا۔ اور مذہب و سلطنت دو الگ الگ خانوں میں منقسم رہے، اس وقت تک قضا و افتاء کے دائرے بھی جدا جدا رہے۔ اس لئے ہمارے ہاں اگر اصولیوں نے اس کے استحقاق کے بارے میں زیادہ احتیاط کا ثبوت دیا اور کڑی اور سخت شرطیں پیش کیں تو یہ بالکل تدرتی بات تھی۔ مگر اب حالات کا نقشہ پلٹ چکا ہے۔ پاکستان نے ایک اسلامی جمہوریہ کی شکل میں اپنے کو پیش کیا ہے۔ اور اس کے نظام آئین میں یہ داخل ہے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں یہ تقنین و آئین سازی کی طرف قدم بڑھائے اس صورت میں اب یہ فرض صرف ایک یا دو چار گنے چنے مجتہدین کا نہیں رہتا کہ تنہا وہی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوں۔ بلکہ اس ذمہ داری میں بحالات موجودہ پاکستان کا ہر وہ شہری شریک سمجھا جائے گا جو فقہ و قانون کی نزاکتوں کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ زمانہ کے مقتضیات کیا ہیں؟ یعنی اب قانون پر غور و فکر بہرحال اجتماعی سطح ہی پر ہوگا، کسی ایک فقیہہ یا مجتہد پر اس بارے میں اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت گو ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس شینری کی تفصیلی وضاحت کریں جو اسلامی قانون کو معرض ظہور میں لا سکتی ہے۔ تاہم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ صورت حالات کی اس تبدیلی سے شرائط اجتہاد کی تقنین و وضاحت کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہا۔ جتنا یہ مسئلہ کہ کسی رائے کو قانون بننے تک کن کن اجتماعی و جمہوری مراحل سے گزرنا چاہیئے۔ اس کا صاف صاف یہ مطلب ہے کہ تصفیہ مسائل کے عمل نے اب قطعی دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ہے کہ کلوکیم میں حصہ لینے والے بعض حضرات نے شرائط اجتہاد پر اس انداز میں غور کیا ہے گویا اب بھی مامون اور ہارون رشید کا زمانہ ہے اور اس عرصہ میں قضاء و افتاء کے خانوں میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ حالانکہ قبائے ملوکیت کی دھجیاں صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بکھریں بلکہ ساری دنیا میں بکھری ہیں اور اگر کہیں کہیں یہ باقی ہے تو بس چند ہی دنوں کی مہمان سمجھئے۔

بدلتا ہوا معاشرہ

دوسرا نکتہ درحقیقت اس درجہ اہم تھا کہ اس پر خصوصیت سے غور ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اسے سہل انگاری کہیئے یا روزمرہ کے مسائل سے پہلوتہی کہ مسئلہ اجتہاد کے سلسلہ میں اس موضوع کو چھیڑا نہیں گیا۔ سوال یہ ہے کہ اجتہاد و استنباط کے حدود میں صرف چند فقہی انداز کے غیر ضروری فروع ہی آتے ہیں۔ یا معاشرہ میں جو بنیادی اور اساسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بحث و تعرض بھی اس کے دائرۂ اختیار میں داخل ہے۔ اکثر حضرات نے بربنائے مصلحت نصوص سے متعلق معقول روش اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ اجتہاد و فکر کی تگ و تاز صرف انہی مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہیں اور وہ جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں۔ ان سے متعلق

کوئی مسلمان غور وفکر کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر محل ہے اور اس سے زندگی کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ خود اجتہاد کے حدود و استثناء کا تعلق نفس اجتہاد سے ہے جس میں بہرحال دو رائے ہو سکتی ہیں اس بنا پر یہ کیونکر جائز ہوگا کہ صرف ایک ہی پہلو کی صحت پر اصرار کیا جائے۔

مزید برآں تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ موقف صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تطلیقات ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا، یا اراضی سواد کی تقسیم کو جن عمومی مصالح کے پیش نظر روکا، اس سے کسی طریق سے بھی اس زاویۂ نظر کی تائید کا سامان بہم نہیں پہنچ پاتا۔

(۸) آج کون غلامی کی کھلے بندوں مذمت نہیں کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ اسلام اس کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا مگر کیا اس تاویل کا ثبوت اس صدی سے پہلے کے اسلامی لٹریچر سے پیش کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہمارے ہاں احادیث و فقہ کے دفاتر کے دفاتر اس مسئلہ کے متعلقات سے بھرے پڑے ہیں اور ہماری تہذیب و تمدن میں اس کو ایک ایسے عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے، کہ آج سے پہلے یہ بات حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ ایک دور ایسا بھی آ سکتا ہے

(۹) جب نہ صرف غلامی کو ناجائز کہا جائے گا۔ بلکہ اس سے متعلقہ تمام نصوص و تصریحات کو غیر ضروری قرار دیدیا جائے گا۔ کیا غلامی کے بارے میں اس موقف سے نصوص متاثر نہیں ہوئیں اور مسائل و تفریعات اور فقہ و حدیث کے ابواب کے ابواب غیر ضروری نہیں ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح آج کنبہ و عائلہ کے مفہوم میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اسی تبدیلی کی بنا پر آج سے برسوں پہلے علامہ اقبال مرحوم نے فرائض و میراث کی نئی تشریح کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جو لوگ میراث و فرائض کے مسائل سے ذرا بھی شغف رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں فروع و اصول اور اطراف و جوانب کا یہ پھیلاؤ یا تقسیم کی پیچیدگیاں محض اس بنا پر اختیار کی گئی تھیں، کہ اسلام جب نازل ہوا ہے اس وقت کنبہ و عائلہ میں وہ تمام افراد شامل سمجھے جاتے تھے جو اس کی حفاظت کرتے تھے، جو اس کے لئے دشمنوں سے لڑتے اور جد و جہد کرتے تھے اور بہت سے قریب یا دور کا نسبی تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایسی مناسبتیں تھیں کہ ایک معقول اور الہامی مذہب کے لئے جن کی رعایت رکھنا ضروری تھا۔ اس وقت صورتِ حالات دوسری ہے۔ اب کنبہ میں وہ پہلا سا پھیلاؤ نہیں رہا ہے اور انفرادیت نے اس کو میاں بیوی اور اولاد تک محصور کر کے رکھ دیا ہے۔ نیز عورت کی معاشی، معاشرتی اور ذہنی ترقی نے بھی استحقاق کے نئے گوشے پیدا کر دیئے ہیں۔ اس بنا پر علامہ کی سفارش نہایت ہی توجہ طلب اور معنی خیز ہے۔

عصرِ حاضر کی خواتین اور فقہا

سب سے بڑی تبدیلی جس نے ہمارے معاشرہ کو متاثر کیا ہے اور جس کی بنا پر متعلقہ مسائل کا پورا نقشہ ہی بدل جاتا ہے وہ موجودہ دور میں عورتوں کی جد و جہد اور فکری و معاشرتی درجہ و مقام کی تبدیلی ہے۔ عموماً تمام مذاہب نے اس کے بارے میں احکام و مسائل کا جو انداز تجویز کیا، وہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ اللہ کی یہ مخلوق نسبتہً کمزور ہے۔ عقل و دانش اور تعلیم و تربیت میں اپسماندہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ معاشی طور پر خود مختار نہیں اور اس لائق نہیں کہ عزت و آبرو سے معاشرہ کی دولت میں ذرا بھی اضافہ کر سکے۔ ان حالات میں بلاشبہ یہ

دوسرے درجہ کی مراعات کی مستحق قرار پاتی ہے اور ہرگز اس لائق نہیں ٹھہرتی کہ زندگی کی تگ و دو میں اصالۃً حصہ لے سکے۔ اور تاریخ کے صفحات میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کی مہر ثبت کر سکے۔ مگر پچھلی ڈیڑھ دو صدی کی تعلیمی و تمدنی جدوجہد نے اس کے ذہنی افق کو خاصہ روشن کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کی ذہنی و فکری سطح بہت بلند ہو گئی ہے۔ اب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اپنے کانوں سے دنیا کی پکار اور تقاضوں کو سننا چاہتی ہے اور خاوند یا کسی ذی محرم کی وساطت و نیابت کی قائل نہیں رہی۔ اس طرح صورتِ حالات میں ایک اصولی اور بنیادی تغیر رونما ہوا ہے کہ پہلے اس کی حیثیت اگر الگ ایسی شے کی تھی جس کے بارے میں غور و فکر کے گوشے تحریک میں آتے تھے تو اب یہ اس غور و فکر میں خود برابر کی شریک اور سہیم ہے۔ پھر معاشی اعتبار سے بھی بڑی حد تک خود مختار ہوتی جا رہی ہے۔ اور اشتراکی ممالک میں تو سیاسیات کے دروبست پر بھی اس کا قبضہ ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ طریقِ جنگ نے ضروری قرار دیا ہے کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ اور پہلو بہ پہلو زندگی کی معرکہ آرائیوں میں حالتِ امن میں کام کریں۔ ان حالات میں فقیہانِ امت سے بجا سوال یہ ہے کہ کس منطق سے اور کس طریقِ استدلال سے ان عورتوں کو ثانوی درجے کے احکام و مسائل پر معلق رکھا جا سکتا ہے۔ یہ اور اس نوع کی اور بھی تبدیلیاں ہیں

(۱۰) جو ہمارے گرد و پیش رونما ہو رہی ہیں اور بالکل ہی نئی اور جراءت مندانہ تشریح و ترجمانی کی طالب ہیں۔ لہٰذا کیا ان سے نپٹنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجتہاد کے دائروں کو وسیع کیا جائے اور مصرح اور غیر مصرح کی قید اٹھا دی جائے اور دیکھا صرف یہ جائے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کی روشنی میں ان مسائل کو کیونکر حل کرنا ممکن ہے۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ زمانہ کا منفق علماء کرام کے فتوئی کا انتظار نہیں کرے گا۔ نئی تبدیلیاں، نئی فقہ اور نئے قانون کی تدوین بہر حال کر کے رہیں گی۔ (امروز)

ندوی صاحب کا مقالہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ آپ یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ ایک اہلِ حدیث (اور لطف یہ کہ اہلِ حدیث) کے قلم سے اس قسم کا مضمون حیرت انگیز ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے صدیوں کے جمود و تعطل کی سرخاتی سلوں کو اس ہمت اور جرأت سے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس جوش میں وہ جہاں جہاں اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ محترم مقالہ نگار کی توجہ ان مقامات کی طرف منعطف کرا دیں تاکہ وہ اپنے موقف پر نظرِ ثانی کر سکیں۔ ذیل کے تبصرہ کا جذبۂ محرکہ یہی ہے۔

(۱) طلوعِ اسلام کا تبصرہ

محترم ندوی صاحب نے سب سے پہلے یہ فرمایا ہے کہ جس طرح انسانی ذوق و بصیرت کی نادرہ کاریاں فطرت کے سادہ خاکوں میں رنگ بھر کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں اسی طرح مذہب کی دنیا میں بھی فیضانِ وحی و الہام کے ساتھ ساتھ انسان کی تعبیر و ترجمانی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نگار گہِ کائنات کا حسن و جمال، فطرت اور انسانی ہاتھ، دونوں کے امتزاج کا رہینِ منت ہے۔ لیکن کہ

باب میں ایک اہم اور باریک فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ کائنات میں ایک چیز ہے وہ خام سالہ جس سے اشیأ فطرت تشکل ہوتی ہیں۔ انسانی ہاتھ، اس خام سالہ کو نت نئے پیکروں میں تبدیل کرتا رہتا ہے اور اس طرح کارگہ کائنات میں تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے یہی تخلیقی اضافے ہیں جن کی بنا پر یہ خالق کائنات سے بڑے فخر سے کہہ سکتا ہے کہ

سفال آفریدی - ایاغ آفریدم

لیکن دوسری چیز ہے خود قوانین فطرت۔ یہ قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں اور انسان ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ ان قوانین کو قرآن سنۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور پورے حتم ویقین سے اعلان کرتا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) مثال کے طور پر پانی کو لیجئے۔ یہ فطرت کا مہیا کردہ خام سالہ ہے جس میں انسان اپنی ہنرمند کاریوں سے طرح طرح کی تبدیلیاں پیدا کر کے مختلف قسم کے کام لیتا ہے دوسری چیز ہے وہ قانون یا فارمولا یعنی (H_2O) جس کے مطابق، دو ناری صفت گیسوں کے امتزاج سے پانی بنتا ہے۔ یہ قانون امتزاج۔ یہ فارمولا غیر متبدل ہے جس میں انسان کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کے اس تناسب میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی ہو جائے تو یہ کرۂ ارض بھک سے اڑ جائے وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۲۳/۷۱)

یہی کیفیت دین کی ہے۔ اس میں کچھ عناصر غیر متبدل ہیں اور کچھ ایسے جن میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی چاہیئے۔ اول الذکر وہ مصرح احکام یا غیر مصرح اصول ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور ثانی الذکر وہ جزئیات ہیں جو قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام متعین کرتا رہتا ہے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ انسانی علم وبصیرت کی مجتہدانہ تگ وتاز کی وسعت اس چار دیواری سے مقید ہے۔ وہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ ثبات وتغیر کے اس حسین امتزاج سے انسانی زیست اور کائنات کا حسن قائم رہتا ہے۔

(۲) الفاظ کا استعمال

آگے چل کر ندوی صاحب فرماتے ہیں۔

ہم ان میں سے نہیں ہیں جو اس اسلام، کو صرف وحی والہام اور الفاظ ونصوص کی حد تک محدود سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں ذوق نبوت کی جمال آرائیوں کو بھی دخل ہے اور آنحضرتؐ کے اپنے اجتہاد وبصیرت کا بھی حصہ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان خیالات کے معنوی استقام کے متعلق کچھ عرض کریں۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ محترم مقالہ نگار کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف مبذول کرائیں کہ جب ہم لطائف کی دنیا کے متعلق گفتگو کریں تو اس میں اجازت ہوتی ہے کہ ہم محض عبارت آرائی کی خاطر جمیل الفاظ اور حسین تراکیب استعمال کرتے چلے جائیں۔ لیکن جب گفتگو دین کے احکام اور حقائق سے متعلق ہو تو بات بالکل صاف۔ واضح محکم اور متعین ہونی چاہیئے جس کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ ایسے استعمال کئے جائیں جن کا مفہوم متعین ہو۔

مثال کے طور پر آپ نے "وحی والہام" کے الفاظ اپنے مقالہ میں بڑی کثرت اور روانی سے استعمال کئے ہیں۔ اس علم کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو براہ راست ملتا تھا، قرآن نے وحی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لہٰذا وحی کا مفہوم اور تصور متعین اور واضح ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو "الہام" کا لفظ لایا گیا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن میں لفظ الہام کہیں نہیں آیا[1]۔ لہٰذا یہ امر وضاحت طلب ہے کہ "وحی والہام" میں الہام سے کیا مقصود ہے اور وحی کے ساتھ اس اضافے کی ضرورت کیا تھی؟

اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ "اس میں ذوق نبوت کی جمال آرائیوں کو بھی دخل ہے۔" سوال یہ ہے کہ یہ "ذوق نبوت" کیا چیز ہے؟ نبوت کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا مطلب، خدا کی طرف سے وحی پانا ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ نبوت خالصۃً وہبی (عطیہ) ہے جس میں نبی کے ذاتی کسب و ہنر یا عواطف و میلانات کا کوئی دخل نہیں ہوتا حتیٰ کہ نبی کو نبوت ملنے سے ذرا پہلے تک، اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲) کتاب کیا ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں؟ نبوت ملنے کے بعد بھی وہ اپنی وحی میں اپنی طرف سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ (۱۰/۱۵) وہ صرف وحی کی اتباع کرتا ہے (اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۱۰/۱۵) ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ "ذوق نبوت کی جمال آرائیاں" محض شاعرانہ انداز بیان ہے جسے حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ "نبوت کا ذوق" یعنی چہ؟

اسی انداز کی ایک ترکیب "الفاظ و نصوص" بھی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا کوئی نص، الفاظ کے بغیر بھی ہو سکتی ہے جو "نصوص" کے ساتھ "الفاظ" کے اضافہ کی ضرورت لاحق ہو گئی؟ نصوص تو ایک طرف، الفاظ کے بغیر کوئی تصور بھی انسانی ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح "اجتہاد و بصیرت" کی ترکیب کو لیجئے۔ کیا حضورؐ کا کوئی اجتہاد بغیر بصیرت کے بھی ہو سکتا تھا جو اجتہاد کے ساتھ بصیرت کا اضافہ ضروری سمجھا گیا۔

ہمارے خیال میں محترم مقالہ نگار جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ فقط اتنا تھا کہ "ہم اسلام کو وحی کی حد تک محدود نہیں سمجھتے۔ اس میں آنحضرتؐ کے اپنے اجتہاد کا بھی حصہ ہے۔" آپ دیکھئے کہ "شاعری" کو الگ کر دینے کے بعد، بات کس قدر واضح اور متعین ہو گئی۔

بہرحال یہاں تک محترم ندوی صاحب نے کہا یہ ہے کہ اسلام نام ہے وحی خداوندی (قرآن) اور حضورؐ کے ذاتی اجتہاد کا۔

لیکن اب وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

---

[1] سورۃ الشمس میں جو فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱/۸) آیا ہے تو اسے وحی سے کچھ واسطہ نہیں۔

(۳) تمدن۔ تصوف۔ شریعت۔ کلام؟

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و سنت کے گل دامان کی چین بندی میں کس کس کا ہاتھ ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ فقہاء عظام کی موشگافیوں نے اس کے جملہ اطلاقات کو ایک نظام عملی کی شکل میں مدون کیا۔ متکلمین اسلام اور حکماء نے اس کے عقلی و فکری نظام کی وضاحت کی۔ اور صوفیاء و شعراء نے اس کے حکیمانہ لطائف کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اور ان سب کی یہ کوششیں اسلام کی بہترین میراث اور نہایت ہی قیمتی ذخیرہ ہیں جن سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیازی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

یعنی ان کے نزدیک اسلام، قرآنی وحی اور آنحضرتؐ کے اجتہاد ہی کا نام نہیں بلکہ (ان کے علاوہ) یہ مجموعہ ہے فقہاء کی موشگافیوں متکلمین کی نکات آفرینیوں اور صوفیاء اور شعراء کی لطائف آرائیوں کا "جن سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیازی اختیار نہیں کی جا سکتی"۔

ہم محترم ندوی صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ بھی محض شاعری ہے۔ "اسلام" کوئی مبہم تصور نہیں جس کی جو تعریف (Definition) ہم چاہیں کر لیں اور جن جن عناصر کو جی چاہے اس کا جزو قرار دیتے چلے جائیں۔ الاسلام اس دین کا نام ہے جو خدا کی طرف سے ملا ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)۔ یقیناً الدین اللہ کے نزدیک الاسلام ہے۔ اسی کو اس نے ہمارے لئے منتخب کیا اور مکمل کر دیا (۵/۳)۔ اب اس کے سوا کوئی دین اس کے ہاں قابل قبول نہیں (۳/۸۵)۔ یہ الدین جس کا نام الاسلام ہے وحی کے ذریعے عطا ہوا اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ انسانی تعبیرات۔ تفسیرات۔ توضیحات وغیرہ اسلام نہیں، اسلام کو سمجھنے، سمجھانے اور مختلف احوال و ظروف میں اس پر عمل پیرا ہونے کی کوششیں ہیں۔ الدین یا الاسلام ابدی۔ اٹل اور غیر متبدل ہے۔ اور انسانی تعبیرات یا عملی نظائر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق قابل تغیر و تبدل۔ نیز ان تعبیرات و توضیحات کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار وہی الاسلام ہے جو وحی کی رُو سے ملا اور جو قرآن میں محفوظ ہے۔ ان میں سے جو قرآن کے مطابق ثابت ہوں ان کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ یہ فلاں دور میں اسلام کے سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی صحیح کوشش تھی۔ ان سے ہم اپنے دور میں اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہی ان کی صحیح پوزیشن ہے۔ نہ یہ کہ جو کچھ فقہاء، متکلمین۔ صوفیاء اور شعراء نے کہہ دیا ہے وہ اسلام ہے اور اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیازی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

---

(۴) آنحضرتؐ کے اجتہاد کی مثالیں

اس کے بعد آپ نے آنحضرتؐ کے اجتہاد کی دو ایک مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ آنحضرتؐ کے اجتہادات (یا یوں کہیئے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے حکم خداوندی کے ماتحت، باہمی مشاورت سے دین کی جزئیات کے تعین) کی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں لیکن

صاحب مقالہ نے جن مثالوں کا انتخاب فرمایا ہے وہ اس حقیقت کی غماز ہیں کہ آپ کے تحت الشعور میں ابھی تک وہی کہنہ عقیدہ کروٹیں لے رہا ہے کہ خدا کی طرف سے جو دین ملا وہ ناقص تھا۔ اسے حضورؐ کے اجتہادات نے مکمل کیا۔ وہ مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

> پہلے قرآن کی ترتیب سورہ کا مسئلہ ہی لیجئے کہ اس باب میں کوئی نص موجود نہیں لیکن آنحضرت نے اس کے باوجود محض اپنے ذوقِ اجتہاد کے بل پر ان میں ترتیب و نظام قائم رکھنے کی تلقین فرمائی۔

یعنی آپ کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی اس میں نہ فقرات (آیات) میں کوئی ترتیب تھی اور نہ ہی ابواب (سور) میں کوئی نظم۔ چھ سات ہزار فقرے یا ایک سو چودہ ابواب منتشر صورت میں، یونہی ڈھیر کرکے رکھ دیئے گئے تھے۔ نبی اکرمؐ نے ان میں ترتیب و نظم پیدا کرکے اس منتشر مجموعہ کو ایک کتاب کی شکل میں مدون کر دیا۔ قطع نظر دیگر دلائل، ہم مولانا صاحب سے ایک چھوٹی سی بات دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں؟ کیا آپ نے کسی ایک کتاب کے متعلق بھی ایسا کیا ہے کہ اس کے فقرات یا ابواب کو منتشر شکل میں، بلا کسی ترتیب و نظم کے، پبلشر کے حوالے کر دیا ہو کہ اسے جس طرح جی چاہے شائع کر دے؟ ساری کتاب تو ایک طرف آپ کی کسی تصنیف میں اگر دو فقرے بھی ایسے پائے جائیں جن میں باہمی نظم و ترتیب نہ ہو، تو آپ اس کتاب کی اشاعت روک دیں اور چھپے ہوئے نسخوں کو تلف کر دیں۔ آپ سوچئے کہ جس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ہم اپنی کسی تصنیف کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ کر سکیں، اسے ہم اس بے تکلفی سے خدا اور اس کی کتاب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اسے بہت بڑا کارنمایاں شمار کرتے ہیں؟ ہم مولانا محترم سے گزارش کریں گے کہ وہ خدا کو زیادہ نہیں تو کم از کم اپنے جیسا باشعور مصنف ہونے کا (credit) ہی دیدیں! اس خدا کو جو اپنی کتاب کے متعلق کہتا ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (۷۵/۱۷-۱۹) دیگر شواہد سے قطع نظر، خود لفظ قرآن کے معنی لغت کی مستند کتابوں میں جَمَعَهٗ وَ ضَمَّ بَعْضَهٗ اِلٰی بَعْضٍ لکھے ہیں (دیکھئے تاج العروس، اقرب الموارد۔ مفردات راغب) کیا ضَمَّ بَعْضَهٗ اِلٰی بَعْضٍ کا مطلب یہی ہے کہ اسے بلا نظم و ترتیب منتشر طور پر دیدیا گیا تھا اور اس کے باوجود اس کا نام قرآن رکھ دیا گیا تھا؟

قرآن اپنی موجودہ ترتیب کے ساتھ خدا کی کتاب ہے جو بذریعہ وحی نبی اکرمؐ کو عطا ہوئی تھی اور جسے نبی اکرمؐ نے اس (مرتب و مدون) شکل میں امت کو دیا تھا۔ لہٰذا قرآن کی ترتیب آنحضرتؐ کے اجتہاد کی صحیح مثال نہیں۔

تحویل قبلہ کی مثال

محترم ندوی صاحب نے دوسری مثال تحویل قبلہ کی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> جب نمازیں فرض قرار پائیں تو سوال یہ ہوا کہ قبلہ کونسا ہو؟ آنحضرتؐ نے فیصلہ کیا کہ بیت المقدس کو سردست مرکز توجہ ٹھیرا لیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سولہ سترہ ماہ تک مسلمان اُدھر رُخ کرکے نمازیں پڑھتے رہے۔ پھر کعبہ کو اس کی بجائے قبلہ مقرر کیا گیا۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ رسول اللہؐ نے بیت المقدس کو اپنے فیصلہ سے قبلہ مقرر کر لیا تھا۔ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جب تک خدا کی طرف سے کسی باب میں خاص طور پر حکم نازل نہ ہو، آپ انبیائے سابقہ کے مسلک کی اقتدار کرتے رہیں۔ سورۂ انعام میں حضرات انبیائے کرام کے نام بنام تذکرہ کے بعد فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۶/۹۰)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت عطا فرمائی تھی۔ سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔ لہٰذا جب تک کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم خداوندی نہیں آیا، آپؐ نے اس عام حکم خداوندی کے ماتحت بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔

اس کے بعد ندوی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ حیرت آمیز بھی ہے اور تاسف انگیز بھی۔ آپ فرماتے ہیں۔

پھر جب کعبہ کو اس کے بجائے قبلہ مقرر کیا گیا تو اس کے لئے بھی طلب و آرزو کے واسطے آنحضرتؐ کے قلبِ اقدس میں ابھرے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۔ اس آیت میں قِبْلَةً تَرْضٰىهَا (۲/۱۴۴) کے الفاظ خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی رضا بھی مطلوب دین ہے۔

...... یہ رضا جسے اللہ تعالیٰ نے اس درجہ درخور اعتنار سمجھا ہے اجتہاد و بصیرت نبوی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

اس میں پہلا مغالطہ یہ ہے کہ ندوی صاحب آرزو اور اجتہاد کو ایک ہی چیز قرار دے رہے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ آرزو کا سرچشمہ جذبات ہوتے ہیں اور اجتہاد کا تعلق علم و عقل سے ہے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اجتہاد اور آرزو کا ایک ہونا تو درکنار اگر اجتہاد میں مجتہد کی آرزو کا کچھ بھی دخل ہو جائے تو ایسا اجتہاد قطعاً اس قابل نہیں رہتا کہ اسے قانون کی حیثیت دی جائے۔ قانون کا اولین تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی خواہشات کے تابع نہ ہو۔ قانون کی بلند ترین شکل وحی ہے، جس میں کسی انسانی جذبہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳/۳) سے یہی مفہوم ہے۔ اس میں ھوٰی سے مراد کوئی معیوب جذبہ نہیں بلکہ مجرد آرزو یا خواہش ہے۔ وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ انسانی جذبات و عواطف سے بلند اور منزہ ہوتا ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ یہ کہنا کہ وحی رسول اللہ کی طلب و آرزو کے مطابق نازل ہوا کرتی تھی، نہ صرف وحی کی بنیادی خصوصیت سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ اس سے قرآن کے متعلق ایسا غلط تصور سامنے آتا ہے جو مخالفین کے سخت ترین طعن و اعتراضات کا ہدف بن سکتا ہے۔ وہ تو پہلے ہی یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول اللہؐ کی اپنی آرزوئیں تھیں جنھیں آپؐ نے (معاذ اللہ) وحی کہہ کر پیش کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اتفاقاً ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو حکم بذریعہ وحی ملتا ہو وہ رسول اللہؐ کی آرزو کے مطابق نکل آئے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ خدا کے نزدیک آنحضرتؐ کی رضا مطلوب دین تھی۔ اور وحی آپ کی آرزوؤں کے مطابق نازل ہوا کرتی تھی۔ اگر آپ کی رضا مطلوب دین ہوتی اور وحی آپ کی آرزوؤں کا اتباع کرتی تو قرآن میں اس قسم کے واقعات کا تذکرہ کیوں ملتا جن میں حضورؐ کی آرزو تو ایک طرف آپؐ کے فیصلوں پر خدا کی طرف سے تادیب آئی۔

(مثلاً) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (۹/۴۳) اللہ تجھے معاف کرے تو نے انھیں کیوں اجازت دی " یا اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۹/۸۰) "اگر تو ان کے لئے ستر مرتبہ بھی مغفرت چاہے تو اللہ انھیں مغفرت عطا نہیں کرے گا۔

یاد رکھئے۔ دین، ابدی قوانین الٰہیہ کا نام ہے جن میں کسی کی خواہش اور آرزو کا کوئی دخل نہیں ۔ نہ ہی کسی کی آرزو کو اجتہاد کہا جا سکتا ہے۔ اجتہاد کسی پہلے سے دیئے ہوئے اصول یا کلیہ سے استنباط جزئیات کو کہتے ہیں اور آرزو کسی ایسی چیز کے حصول کا جذبہ ہوتا ہے جو پہلے سے حاصل نہ ہو۔

---

(۵) آنحضرتؐ کے اجتہاد کی حیثیت

اس کے بعد محترم مقالہ نویس فرماتے ہیں کہ

(۱) آنحضرتؐ کے مجتہدات تشریعی کو ماننے کے ہم بہر حال مکلف ہیں

(۲) اس لئے مکلف ہیں کہ ان مجتہدات میں اگرچہ سہو و خطا کا اس طرح امکان پایا جاتا ہے جس طرح کہ عام مجتہدین کے نتائج فقہی میں۔ مگر وحی و الہام کی نگرانی چونکہ اس سہو و غلطی کو قائم نہیں رہنے دیتی اور عنایتِ الٰہی اور فیضانِ ربوبیت چونکہ آنحضرتؐ کے فہم و فکر کی استواریوں کا بہترین اور کامیاب ضامن و کفیل ہے اس لئے ضروری ہے کہ آپ کا اجتہاد محض ایک مجتہد اور فقیہہ کا اجتہاد نہ رہے بلکہ شریعت و دین کا تقاضا اور جزو ہو اور اس لائق ہو کہ اسے مانا اور تسلیم کیا جائے۔

آپ غور کیجئے کہ اتنے سے ٹکڑے میں کس قدر بنیادی استقام ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ

(۱) آنحضرتؐ کسی مسئلہ میں اجتہاد فرماتے تھے۔ اس اجتہاد میں عام مجتہدین کی طرح سہو و خطا کا امکان ہوتا تھا۔ لیکن وحی خداوندی اس سہو و خطا کو قائم نہیں رہنے دیتی تھی - اس کی تصحیح کر دیتی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ

(ب) عنایت الٰہی اور فیضان ربوبیت آنحضرتؐ کے فہم و فکر کی استواریوں کی بہترین اور کامیاب ضامن و کفیل ہوتی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ جب فیضانِ ربوبیت اور عنایت الٰہی آنحضرتؐ کے فہم و فکر کی استواری کی ضامن ہوتی تھی تو پھر آپ کا اجتہاد اوّلاً ہی صحیح اور درست کیوں نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب آپؐ اجتہاد کرتے تھے تو اس میں سہو و خطا ہوتا تھا اور پھر اس سہو و خطا کا ازالہ وحی کی رو سے ہو جاتا تھا۔ یہ " عنایات الٰہی اور فیضان ربوبیت " کی اچھی ضمانت و کفالت ہے کہ آپ کی فکر سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ کیا اس کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے متعلق آنحضرتؐ نے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم دیا ہو اور قرآن نے یہ کہہ کر اس حکم کی تصحیح کی ہو کہ اس میں آپؐ سے یوں سہو و خطا

ہوگیا تھا!

بہرحال، یہاں تک ایک بات تو واضح ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ وہ جو کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ کہا یا کیا، سب وحی کی رُو سے تھا۔ اور وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ محترم ندوی صاحب نے اس عقیدہ کی تو تردید کردی۔ انھوں نے تسلیم کرلیا کہ آنحضرتؐ کے مجتہدات، عام مجتہدین کی طرح آپ کے فہم و بصیرت کا نتیجہ ہوتے تھے۔ البتہ "وحی و الہام" اور "عنایت الٰہی اور فیضانِ ربوبیت[1]" آپ کو ان غلطیوں پر قائم نہیں رہنے دیا کرتی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حضورؐ کے یہ مجتہدات دین کا جزو تھے اور واجب التسلیم۔ گویا پہلے

⑦ اجتہاد کے دوائر

حصہ میں آپ مسلکِ اہلِ حدیث سے ہٹ جاتے ہیں اور دوسرے حصہ میں پھر انہی سے جاملتے ہیں۔ لیکن ٹھہریئے۔ اور دیکھئے کہ اگلے ہی قدم میں ندوی صاحب کہاں چلے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> اکثر احباب نے بر بنائے مصلحت نصوص سے متعلق معقول روش اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ فکر و اجتہاد کی تگ و تاز صرف انہی مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب و سنت میں مذکور نہیں۔ اور جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں ان سے متعلق کوئی مسلمان غور و فکر کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر محلِ نظر ہے اور اس سے زندگی کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

دیکھئے! ابھی ابھی آپ یہ کہہ رہے تھے کہ آنحضرتؐ کے مجتہدات دین کا جزو اور واجب التسلیم ہیں۔ اور اب یہ فرما رہے ہیں کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے کہ سنّت رسول اللہؐ کی تصریحات میں کوئی مسلمان غور و فکر کا مجاز نہیں۔ ان میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اس کی تائید میں آپ نے حضرت عمرؓ کے تطلیقات ثلاثہ اور اراضی سواد کی تقسیم کے فیصلوں کو بطور سند پیش کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ ایک نبی کے اجتہاد کو (جس کے سہو اور خطا کا ازالہ وحی نے کردیا تھا) ایک غیر نبی کا اجتہاد بدل سکتا ہے۔

⑧ ⑩ بارِش باباہم بازی!

لیکن ندوی صاحب تصریحات سنت کے متعلق ہی یہ ارشاد نہیں فرماتے۔ ان کا ارشاد یہ بھی ہے کہ خود کتاب اللہ میں بھی جو تصریحات دی گئی ہیں ہم اپنے اجتہاد سے ان میں تبدیلیاں کرسکتے ہیں۔ اور وقت آگیا ہے کہ ان میں تبدیلیاں کی جائیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

> اسلامی نقطۂ نظر سے وحی و الہام کے یہ معنی قطعی انسب نہیں کہ فکر و اجتہاد کی تگ و تاز پر پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ اور علم و ادراک کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی حقیقی منافات پائی جاتی ہے۔

---

[1] معلوم نہیں ندوی صاحب کا اس قسم کی تراکیب سے مطلب کیا ہے؟ کیا عنایت الٰہی اور فیضانِ ربوبیت، وحی سے کوئی الگ شے تھی؟

اور یہ کہ

> زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ اجتہاد کے دائروں کو وسیع کیا جائے اور مصرح اور غیر مصرح کی قید اڑا دی جائے اور دیکھا صرف یہ جائے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کی روشنی میں ان مسائل کو کیونکر حل کرنا ممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر وحی والہام نے فکر و اجتہاد کی تگ و تاز پر کوئی پابندی عائد نہیں کی اور علم و ادراک کے ان دونوں سرچشموں (وحی اور عقل) میں کوئی حقیقی منافات نہیں۔ تو پھر "اسلام کی بنیادی اور اساسی تعلیم" یا "بنیادی اقدار" کو عقلی اجتہاد کے دائرے سے باہر کیوں رکھا جائے۔ کیوں نہ انہیں بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جس قدر کو اس کے ہاں سے سند قبولیت حاصل ہو جائے اسے باقی رکھا جائے (اور وہ بھی اس وقت تک جب تک کسی دوسرے وقت کی عقل اُسے مردود نہ قرار دیدے) اور جسے عقل ٹھکرا دے اُسے مسترد قرار دیدیا جائے۔ زمانہ کا منشی تو اس کا بھی تقاضا کر رہا ہے۔

⑧ غلامی کا مسئلہ

مقالہ نگار نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ قرآن کی تصریحات بھی اس قابل ہیں کہ ان میں تبدیلی کر دی جائے، غلامی کے مسئلہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن نے غلامی کی اجازت دی تھی اور اسی بنا پر ہماری کتب روایات و فقہ میں غلام اور لونڈیوں کے متعلق اس قدر تفریعات موجود ہیں۔ اب زمانہ کے تقاضے سے مجبور ہو کر مسلمان یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ غلامی اسلام میں ناجائز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی نصوص اور فقہ و احادیث کی تفریعات کو مٹانا پڑے گا۔

هم ندوی صاحب کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

اگر آپ قرآن کو، فقہ و روایات سے الگ ہٹ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی کہ قرآن نے غلامی کو پہلے دن ہی سے ناجائز قرار دیدیا تھا۔ لہذا ایک قرآنی مسلمان کے لئے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی تصریحات میں تبدیلی کرنے لگ جائے۔ قرآنی اصول ہوں یا تصریحات، اپنے مقام پر اٹل ہیں اور زمانہ کا کوئی تقاضا ان میں تبدیلی کا متقاضی نہیں ہو سکتا۔

⑨ میراث و فرائض کے مسائل

آپ نے دوسری مثال میراث (فرائض و ترکہ کی تقسیم) کے مسائل کی دی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جن حالات میں قرآن نے حصص مقرر کئے تھے اب وہ بدل چکے ہیں اس لئے ان میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

هم جناب ندوی کی خدمت میں عرض کریں گے کہ

(۱) قرآن کی رُو سے میراث کا سوال صرف اس وقت تک پیدا ہوتا ہے جب تک قرآنی معاشرہ قائم نہیں ہوتا۔ قرآنی

معاشرہ میں کسی کے پاس زائد از ضرورت مال یا جائداد رہ نہیں سکتی اس لئے اس میں ترکہ کی تقسیم کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

(۲) جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہوں اور میراث کی تقسیم کا سوال سامنے آئے۔ قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے کل مال کی تقسیم کے متعلق اپنے مخصوص حالات کے مطابق وصیت کر جائے۔ لہٰذا اگر موجودہ زمانے کے حالات نے کنبہ کو میاں بیوی اور اولاد تک محدود کر کے رکھ دیا ہے تو ایک قرآنی مسلمان کے لئے یہ تبدیلی کوئی ایسی دشواری پیدا نہیں کرتی جس سے قرآنی تصریحات میں تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے۔

علامہ اقبال کا نام

ندوی صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں علامہ اقبال کو بھی بطور گواہ پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت علامہ بھی زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآن کے قانون وراثت میں تبدیلی پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ علامہ نے اس خیال کا اظہار کہاں فرمایا ہے۔ اس کے برعکس ہمیں معلوم ہے کہ جب ترکی کے شاعر ضیا نے یہ کہا کہ عورت کو بھی مرد کے برابر حصہ ملنا چاہیئے تو علامہ اقبال نے (اپنے خطبات میں) کھلے الفاظ میں اس کی مخالفت کی اور یہ بتایا کہ قرآن کا تجویز کردہ حصہ کس طرح عدل اور معاشی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ علامہ اقبال مروجہ فقہی جزئیات وفروعات میں تبدیلیوں کے خواہاں تھے اور اسی لئے ان کی آرزو تھی کہ اسلام کی ایک جدید فقہ مرتب کی جائے۔ لیکن وہ قرآنی قانون میں تبدیلی کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کیا ندوی صاحب فرمائیں گے کہ علامہ اقبال نے قرآن کی تصریحات میں تبدیلی کے لئے کہاں لکھا ہے؟

ہم اتنا اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے یہ کچھ اس لئے لکھا ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق علامہ اقبال کبھی قرآنی قوانین میں تبدیلی کی تائید میں نہیں تھے، لیکن اگر بفرض محال یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اقبال یا انہی کے ہم پایہ کوئی اور بزرگ اس قسم کی تبدیلی کے حق میں تھے تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ ان کا یہ خیال قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف تھا۔ "لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ" میں صرف قرآن کی بنیادی اقدار ہی شامل نہیں۔ اس میں قرآن کا ایک ایک لفظ شامل ہے۔ وَ اللهُ عَلٰى مَا نَقُولُ شَهِيدٌ؛

رو کے ہے مجھے کعبہ تو کھینچے ہے مجھے دَیر

ندوی صاحب کا مقالہ اور اس کے اہم نکات پر ہمارا مختصر تبصرہ آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ یہ مقالہ ایک ایسی نفسیاتی کشاکش کا غماز ہے جو ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ ندوی صاحب جس مسلک اہل حدیث پر پہلے کاربند تھے انہوں نے اسے اصل دین سمجھ رکھا تھا۔ اب جو ان کے دماغ میں تنقیدی شعور نے کروٹ لی تو انہیں وہ مسلک بہت کمزور نظر آیا۔ لیکن چونکہ انہوں نے اسی مسلک کو اصل دین سمجھ رکھا تھا وہ جھٹ سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ دین، وقتی تقاضوں کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخ کے ایک خاص دور میں معاشرہ کی تشکیل کا نام تھا۔ اب جب وہ تقاضے ہی نہیں رہے تو

دین کی عائد کردہ پابندیاں بھی بے معنی ہو چکی ہیں لہذا ان کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہیں بنیادی اقدار (جنہیں ندوی صاحب باقی رکھنا چاہتے ہیں) تو یہ وہی چیز ہے جسے ابوالکلام آزاد مرحوم "عالمگیر سچائیاں" کہا کرتے تھے اور جن کے متعلق ان کا اعلان تھا کہ وہ "تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" یعنی جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو ستاؤ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ندوی صاحب بعینہ اسی مقام پر آگئے ہیں۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مولانا آزاد بھی اس قسم کا عقیدہ رکھنے کے باوجود پکے اہل حدیث تھے اور مولانا حنیف ندوی صاحب بھی اس جدید مسلک کے باوجود ایک ممتاز اہل حدیث ہیں۔ اپنی جماعت کے ساتھ رہنے کا شعوری یا غیر شعوری جذبہ اور تجدد پسندی کا ذوق یا زمانہ کا تقاضا وہ دوراہہ تھا جس پر مولانا آزاد مرحوم عمر بھر کھڑے رہے اور اپنی شدید اندرونی کشمکش کو پرشکوہ الفاظ کے نظر فریب پیرہن میں چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی دوراہہ پر محترم ندوی صاحب پہنچ چکے ہیں اور انہی کی طرح اپنی کشمکش کو، ماہنامہ رحیق کے الفاظ میں "پیچ در پیچ عبارت میں لپیٹ لینا یا بالفاظ دیگر "چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ دین کے متعلق بات صاف اور واضح الفاظ میں نہایت آسانی سے ہو سکتی ہے۔

عصبیت جاہلیت

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم کے کسی حکم میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے اصولی قوانین کی روشنی میں جو جزئیات کسی ایک زمانہ کے اسلامی نظام نے متعین کی ہوں ان میں دوسرے دور کا ویسا ہی اسلامی نظام اپنے زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے تبدیلی کر سکتا ہے۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی بنا پر طلوع اسلام کو منکر حدیث، منکر شان رسالت، منکر ناموس نبوت اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر دیگر فرقوں کی طرف سے بالعموم اور اہل حدیث کی طرف سے بالخصوص قابل دار ورسن قرار دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے جس سے شور قیامت بھی پناہ مانگے۔

اب مولانا ندوی صاحب کو دیکھئے، وہ بصراحت لکھتے ہیں کہ اسلام کی اساسی اقدار کو چھوڑ کر باقی تمام دینی احکام میں (خواہ وہ کتاب اللہ میں ہوں یا احادیث میں) عام اجتہاد سے تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ ان کا یہ مضمون گذشتہ مارچ میں شائع ہوا تھا۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں (دوسرے مسلمانوں کو چھوڑیئے) خود اہل حدیث کی طرف سے بھی ایک لفظ ان کے خلاف سننے میں نہیں آیا۔ اس جماعت کے ایک ترجمان ماہنامہ رحیق نے اپنی جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ

> "ان کا (ندوی صاحب کا) یہ نظریہ اہل حدیث کے مسلک سے صریحاً متصادم ہے، مسلک اہل حدیث کی تو بنیاد ہی اس اصول پر ہے کہ نصوص کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی بھی مجتہد و امام کا اجتہاد و قول قابل تسلیم نہیں، پھر بیچارے یہ متجددین کس شمار و قطار میں ہیں ان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ مصالح وقتیہ پر نصوص صریح کو قربان کر کے اسلام میں ترمیم کریں"

آپ نے غور فرمایا کہ طلوعِ اسلام اگر اتنا کہے کہ آنحضرتؐ کے فیصلوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ یا عمر بن الخطابؓ اپنے وقت کے مطابق تبدیلی کر سکتے تھے تو اس کا یہ جرم اتنا بڑا ہے جس کی کہیں معافی نہیں ہو سکتی، لیکن اگر جمعیت اہلحدیث کی مجلس عاملہ کے رکن مولانا حنیف ندوی صاحب یہ کہیں کہ رسولؐ کے فیصلوں میں ہی نہیں بلکہ خود خدا کے فیصلوں میں بھی ہم لوگ اپنے ذاتی اجتہاد سے ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں تو ان کے خلاف ہمارے حامیانِ دینِ متین میں سے کسی کی رگِ حمیت نہ پھڑکے! ہمارا مطلب یہ نہیں کہ حنیف صاحب کے خلاف بھی پروپیگنڈا کیا جائے۔ بالکل نہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام اور حنیف صاحب کے معاملہ میں ایسا بین تمیزی سلوک کیا محض اس وجہ سے نہیں کہ حنیف صاحب بہرحال اپنی پارٹی کے آدمی ہیں (یعنی وہ خود مولوی ہیں اور مولویت کے خلاف کچھ نہیں کہتے) اور طلوعِ اسلام مولویوں کی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا؟ اس سے ظاہر ہے کہ ان حضرات کو اس سے کوئی تعرض نہیں کہ کوئی دین کی کس اصل کو کاٹتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ مُلّائیت کے خلاف کون کچھ کہتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ میں پیشوائیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتا اور اس حقیقت کا کھلے بندوں اعلان کرتا ہے۔

آخری گذارش

آخر میں ہم چند الفاظ مولانا حنیف ندوی صاحب کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ جس طرح کسی ملحد بے دین کا دینداری کے ذوق میں "عبدالماجد دریابادی" بن جانا دین کے نقطۂ نگاہ سے خوبی کی بات نہیں اسی طرح کسی قدامت پرست اہلِ حدیث کا تجدد پسندی کے دفورِ شوق میں "نیاز فتحپوری" بن جانا بھی کوئی قابلِ قدر بات نہیں۔ فکر و اجتہاد کی صحیح آزادی کے معنی یہ ہیں کہ وحی نے (مصرح و غیر مصرح) جو کچھ عطا کیا ہے اسے غیر متبدل سمجھا جائے اور اس کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے فکر کو کامل آزادی دی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ محترم ندوی صاحب ہماری اس پرخلوص گذارش کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے۔ اور انسانوں کے خود ساختہ طوق و سلاسل کو توڑنے کے جوش میں وحی کی تصریحات کو خیرباد کہنے کی حد تک نہیں پہنچ جائیں گے۔ طائرِ فکر کے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

یہ شاخِ آشیانہ، وحی (قرآن) ہے جو اپنی تصریحات اور غیر مصرح اصولات دونوں کا مجموعہ ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قرآنی تصریحات محض وقتی اور ہنگامی ہوتیں تو انہیں قرآن میں دیا ہی نہ جاتا۔ قرآن میں صرف اصول دیئے جاتے اور ان کی تصریحات کو اسلامی نظام کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جاتا۔ ان تصریحات کا وحی کی رُو سے متعین ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ بھی اساسی اقدار کی طرح غیر متبدل ہیں۔

حقائق و عبر

پرویز کا جرم

محترم عبدالماجد صاحب دریابادی، اپنے اخبار (صدق جدید۔ لکھنؤ) میں لاہور کلوکیم کے متعلق اپنے تاثرات بالاقساط شائع کر رہے ہیں۔ جو قسط ۵ مئی کے پرچہ میں چھپی ہے اس میں حسب ذیل الفاظ میں پرویز صاحب کا بھی ذکر آیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جلسہ ہی میں ایک دن روشن خیالوں کے امام پرویز صاحب (طلوع اسلام والے) نظر پڑے۔ ایک صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی ہیں۔ ان کی شکل پہلی بار دیکھنے میں آئی۔ لیکن ان کا نام اور ان کی تحریریں میرے لئے نئی ذرا بھی نہیں، مدت ہوئی جب یہ حکومت ہند کے سکرٹریٹ میں دہلی میں تھے۔ اور صدق کا نقش اول سچ نکل رہا تھا، تو یہ اس کے خاص ہمدردوں اور علمی معاونوں میں تھے۔ نگار کی ملحدانہ تحریروں اور اس وقت کے مشہور منکر حدیث ڈپٹی مقبول احمد (حق گو) کے خلاف جب سچ کو مستقل مہم چلانا پڑی تھی۔ تو پرویز صاحب اس مہم کی صف اول میں تھے۔ سنہ ۳۱ء ۳۲ء ۳۳ء میں ان کے مضمون کثرت سے سچ میں نکل چکے ہیں معارف وغیرہ سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی مخلصانہ تھے۔ بڑے اچھے خاصے پر جوش مجاہد تھے، یہ حال ایک دو دن نہیں۔ برسوں رہا۔ اور ان کے محبت بھرے اور کارآمد خط شاید سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس جمع ہو گئے تھے ــــ انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِينَ میں بیان فطرت بشری کا ہے۔ نفس ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور شیطانی ترغیبات نے بڑے بڑوں کو خراب کر کے رکھا ہے۔ واللہ اعلم بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا۔ اور اس کے اثر سے پرویز صاحب بجائے ایک مخلص و سرگرم کارکن کے اپنے کو ایک فاضل محقق خیال کر بیٹھے اور اس کے بعد معاف فرمایا جائے کام پہلے سے مولوی صاحبان سنے مند لگا لگا کر اور ذاتی حملہ کر کے خراب کیا۔

بہر حال پرویز صاحب سے ملاقات رہی اور وہ بڑی اچھی طرح سے ملے جس طرح ایک بھلے آدمی کو ملنا

چاہیئے۔ ان کا مقالہ (انگریزی) تفسیری غلطیوں سے پُر تھا، شدید نزلہ کے باعث میں تیسرے پہر کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ البتہ ایک تنقیدی پرچہ لکھ کر سکریٹری صاحب مذاکرہ کو دے آیا تھا، کہ اُسے پڑھ کر سُنا دیا جائے ۔۔۔ میں تو طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں ان کی اور کتابیں معارف القرآن وغیرہ بھی دیکھنے کا اتفاق برائے نام ہی ہوا۔ البتہ اس کا اندازہ ہوا کہ پرویز صاحب صدق کو اپنے مطالعے سے مشرف فرماتے رہتے ہیں۔ اس کا بھی اندازہ ہوا کہ پاکستان کے ایک اونچے طبقہ میں ان کا اثر اچھا خاصہ ہے اور بعض پڑھے لوگ "انہیں ایک امام یا مجتہد کے درجہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے بعد ہم لوگوں کو ضرورت اور زیادہ محتاط رہنے کی ہے، یعنی ان کے عقائد پر گرفتیں تو خوب کی جائیں۔ اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی پردہ دری میں مروت سے اور چشم پوشی سے کام ذرا بھی نہ لیا جائے۔ لیکن اُن کی ذات کو موضوعِ بحث اور ان کی شخصیت کو ہدفِ تمسخر و تضحیک بنائے رکھنا ہرگز کوئی دینی خدمت نہیں۔

ہم نے اس اقتباس کو اس لئے شائع نہیں کیا کہ اس میں پرویز صاحب کا ذکر ہے۔ اس میں چند اصولی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے تو ہمارے مذہبی حلقوں میں جو خلفشار پیدا ہو رہا ہے اس میں بڑی حد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔

(۱) محترم دریابادی صاحب فرماتے ہیں کہ پرویز صاحب کی ایک رودن نہیں، برسوں یہ کیفیت رہی ہے کہ وہ اچھے خاصے پُرجوش مجاہد تھے۔ ملحدین اور منکرین حدیث کے خلاف جو مہم چلائی جاتی تھی اس میں یہ صفِ اوّل میں ہوتے تھے۔ ان کے اکثر مضامین سچ اور معارف میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے خطوط محبت بھرے اور کارآمد ہوتے تھے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی؛ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ہم خیال حضرات کو تاکید کرتے ہیں کہ پرویز صاحب کے عقائد پر گرفتیں کی جائیں۔ ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی پردہ دری میں ذرا مروت اور چشم پوشی سے کام نہ لیا جائے۔

یعنی دریابادی صاحب پورے حتم و یقین سے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ پرویز صاحب بگڑ چکے ہیں ان کے عقائد خراب ہو گئے ہیں۔ وہ گمراہیاں پھیلا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت نہایت ضروری ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دریابادی صاحب کو اس کا بھی اقرار ہے کہ وہ طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے محروم رہتے ہیں اور انہیں پرویز صاحب کی اور کتابیں (معارف القرآن وغیرہ) دیکھنے کا اتفاق بھی برائے نام ہوا ہے

سوال یہ ہے کہ جب آپ نہ طلوعِ اسلام کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ اور نہ ہی آپ کو پرویز صاحب کی تصانیف دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے (اور اگر ہوا ہے تو محض برائے نام) تو پھر آپ پرویز صاحب کے عقائد اور گمراہیوں کے متعلق اس یقینی نتیجہ تک پہنچ کس طرح سے گئے؟ جواب ظاہر ہے کہ آپ نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا اور خود تحقیق کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی۔ حقیقت

یہ ہے کہ پرویز صاحب کے خلاف جو لوگ دن رات پراپیگنڈے میں مصروف ہیں، ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے انکی کسی تحریر کا براہ راست مطالعہ کیا ہو۔ بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ جن باتوں کو پرویز صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان میں نوے فی صد ایسی ہوتی ہیں جنھیں پرویز صاحب نے کبھی کہا ہی نہیں اور جو دس فی صد ان کی ہوتی ہیں انھیں کتر بیونت سے ایسے معنی پہنائے جاتے ہیں جو مصنف بچارے کے حیطۂ خیال میں کبھی نہیں ہوتے۔ یہ حالت تو ہے کہنے والوں کی باقی رہے سننے والے سو ان میں کوئی اتنی تکلیف بھی نہیں کرتا کہ پرویز صاحب سے پوچھ لے کہ تم کیا کہتے ہو۔

یہ ہے سب سے پہلی خرابی جس کی وجہ سے ہمارے مذہبی حلقہ میں اس قدر خلفشار واقع ہو رہا ہے۔

(۲) محترم دریابادی صاحب، پرویز صاحب کے قدیم مسلک و خیالات کی تعریف کے بعد فرماتے ہیں کہ "انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ میں بیان فطرت بشری کا ہے۔ نفس ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور شیطانی ترغیبات نے بڑے بڑوں کو خراب کر کے رکھا ہے۔" یعنی دریابادی صاحب پہلے تو بلا ذاتی تحقیق، ایک نتیجہ پر پہنچ گئے اور اس کے بعد دل کے پورے اطمینان کے ساتھ فتویٰ صادر فرما دیا کہ پرویز صاحب کا یہ سب بگاڑ، شیطانی ترغیبات اور نفسانی خواہشات کی وجہ سے ہے۔ ہم ان سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ذمہ داری اور دیانت کا یہی تقاضا ہے کہ پہلے تو محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا جائے اور پھر اس کے بعد دوسروں کی نیت پر حملے کرنے شروع کر دیئے جائیں؟ بات آپ نے اتنی کہی ہے کہ پرویز صاحب پہلے آپ حضرات سے ہم خیال تھے۔ اس کے بعد انھیں آپ سے اختلاف ہو گیا۔ جب تک وہ آپ کے ہم خیال تھے وہ "اچھے خاصے مجاہد اور مخلص سرگرم کارکن تھے۔ لیکن جب آپ سے اختلاف ہو گیا تو وہ نفس پرست اور شیطان کے متبع ہو گئے۔ اگر آپ ان کی نفس پرستی اور اتباع شیطانی کی تائید میں ذاتی تحقیقات کے بعد کوئی دلائل و شواہد پیش کرتے تو اور بات تھی۔ لیکن جس طرح آپ بات کر رہے ہیں اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جب تک کوئی شخص آپ حضرات سے ہم نوا رہے وہ حق پرست اور تقویٰ شعار ہے، لیکن جونہی اس نے آپ سے اختلاف کیا وہ باطل پرست اور عبد الطاغوت ہو گیا۔

اس ذہنیت کے حامل صرف دریابادی صاحب ہی نہیں۔ قریب قریب سارا مذہبی طبقہ ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہے۔

دریابادی صاحب خود ہی فرماتے ہیں کہ "واللہ اعلم بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا" دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب اس بات کا علم آپ کو نہیں۔ اللہ کو ہے کہ پرویز صاحب کا بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا تو اس کا علم آپ کو کیسے ہو گیا کہ اس بگاڑ کا سرچشمہ شیطان کی ترغیبات اور نفس کے میلانات تھے؟ یا تو آپ اس علم کو اللہ پر نہ چھوڑتے۔ خود تحقیق کرتے کہ بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا۔ اس صورت میں آپ کو حق حاصل تھا کہ اپنی تحقیق کے نتائج کا اعلان فرما دیتے۔ اور اگر آپ نے اس علم کو اللہ پر چھوڑنا تھا تو اس "بگاڑ" کے محرکات کو بھی اللہ ہی پر چھوڑتے۔

(۳) ضمناً ایک تحقیقاتی سی بات سامنے آگئی محترم موصوف نے فرمایا ہے کہ انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی - ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ میں بیان فطرت بشری کا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت ایسی ہے کہ اسے بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی، وہ شیطانی ترغیبات اور نفسانی خواہشات کے پھندے میں بہت جلد پھنس جاتی ہے - لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا کا ہر ایک یہی مطلب بتاتا ہے) - اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو فطرت خدا کی ہے وہی فطرت انسان کی ہے - تو کیا ہم یہ مانیں کہ (معاذ اللہ) خدا کی فطرت بھی ایسی ہے جیسی انسان کی وہ فطرت ہے جس کا نقشہ دریابادی صاحب نے اوپر پیش کیا ہے - ؟

(۴) دریابادی صاحب فرماتے ہیں کہ پہلے تو پرویز صاحب مخلص و سرگرم کارکن تھے - پھر انھوں نے اپنے آپ کو محقق خیال کرنا شروع کر دیا یہ ہے پرویز صاحب کا اصلی جرم - اس کا مطلب یہ ہے کہ دریابادی صاحب کے نزدیک مخلص مسلمان کا شیوہ یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے جو کچھ کہا جائے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا جائے کسی معاملہ میں خود تحقیق نہ کرے۔

اگر یہ جرم ہے تو اس کے مرتکب پرویز صاحب ضرور ہیں - بلکہ یوں کہیئے کہ ان کا جرم یہی ہے کہ جن باتوں کو وہ اس سے پہلے اندھی تقلید کی رُو سے مانتے تھے، اب انھیں قرآن کریم کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت مانتے ہیں اور اسی طریق پر ماننے کی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں - ہم محترم دریابادی صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ اور اگر وہ پرویز صاحب کی کتابوں اور طلوع اسلام کا مطالعہ فرمائیں گے تو وہ ہم سے از خود متفق ہو جائیں گے کہ پرویز صاحب اب بھی "نگار" کی ملحدانہ تحریروں اور "حق گو" جیسے منکرین حدیث کے مسلک کے اسی طرح خلاف ہیں جس طرح آج سے پچیس تیس برس پہلے تھے - فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت وہ اپنے مسلک کے تقلیداً پابند تھے اور اب وہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن کریم کی سند سے علیٰ وجہ البصیرت کہتے ہیں - وہ نہ کسی نئے فرقے کے بانی ہیں نہ ارکان اسلام میں کسی جدت کے موجد - وہ خود بھی ان کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح پہلے تھے اور دوسروں سے بھی بصراحت کہتے ہیں کہ کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اُمت میں جو طریقے متواتر چلے آ رہے ہیں ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے - وہ فرقہ بندی کو (از روئے قرآن) شرک سمجھتے ہیں اور اس کے مٹانے کے لئے خلافت علیٰ منہاج رسالت کے دوبارہ قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں - اس کے لئے وہ کوشاں ہیں اور اس سے زیادہ اخلاص و سرگرمی کے ساتھ کوشاں جس کا ذکر محترم دریابادی صاحب نے فرمایا ہے۔

امید ہے محترم موصوف ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

---

۲ - ہنسیلام

روزنامہ آفاق کی مورخہ ... کی اشاعت میں حسب ذیل شرمناک اور عبرت انگیز خبر شائع ہوئی ہے - بنوں سے آمدہ ایک اطلاع کے مطابق اس ضلع کے ایک گاؤں گگڑی میں ایک شخص نے اپنی ... سالہ

اور حسین بیٹی کو ایک سو روپے فی سیر کے حساب سے تول کر فروخت کر دیا۔ تولنے کے بعد اس کی قیمت پانچ ہزار روپے مقرر کی گئی۔

آمدہ اطلاعات کے مطابق اس گاؤں میں یہ رواج ہے کہ یہاں کے کچھ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے وقت دولہا سے وہ تمام اخراجات پہلے ہی وصول کر لیتے ہیں جو انھیں اپنی بیٹی کی شادی جہیز اور برات وغیرہ کی تواضع پر صرف کرنا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی رسم کے سلسلہ میں مذکورہ بالا واقعہ رونما ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب برادری میں لڑکی کا ہونے والا دولہا اپنے سسرال والوں کو منہ مانگی رقم نہ دے سکا تو اس پر برادری کے نوجوان لڑکوں نے اسے غیرت دلائی کہ لیئے لڑکی کی بولی دینا شروع کی اور بالآخر ایک متمول مینڈا کی یہ پیش کش قبول کر لی گئی کہ وہ اس لڑکی کو اپنی بیوی بنانے کے لئے ایک سو روپیہ فی سیر کے حساب سے تول کر خریدنے کے لئے تیار ہے۔ چونکہ یہ بولی سب سے بڑی تھی اس لئے قبول کر لی گئی۔ لڑکی کو ترازو میں بٹھا کر تولا گیا اور اس طرح پانچ ہزار روپے کی رقم اس کے وزن کے حساب سے ادا کر دی گئی۔

یہ رقم وصول کرنے کے بعد لڑکی کے باپ نے مطالبہ کیا کہ رخصتی سے پہلے نکاح کی معمولی کی رسم پوری کر لی جائے۔ جس پر خریدار نے کوئی اعتراض نہ کیا مگر لڑکی نے احتجاج کرتے ہوئے اپنے باپ کی اس خواہش کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو باپ اپنی لڑکی کو فروخت کر چکا ہو۔ اسے ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور وہ نکاح کے بغیر ہی خریدار کے ساتھ چلی گئی۔

عبرانی زبان میں جہنم؛ اُس وادی کو کہتے تھے جس میں زندہ انسانوں کو جلا کر دیوتاؤں کے حضور بطور قربانی پیش کیا جاتا تھا۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ہنوں کے گاؤں میں جو کچھ ہوا ہے اور اس قسم کے واقعات عام طور پر ہوتے رہتے ہیں، کیا جہنم کی وادی اس سے زیادہ انسانیت سوز ہو سکتی تھی؟

اس خبر کو شائع ہوئے قریب دو ہفتے ہو گئے۔ ہم نے کہیں نہیں دیکھا کہ اس واقعہ پر ہمارے ارباب شریعت کی رگ حمیت میں کسی قسم کا ارتعاش پیدا ہوا ہو اور انھوں نے اس شرمناک رسم کے خلاف کوئی آواز بلند کی ہو۔ ذرا سوچیئے کہ جس معاشرہ میں عورت کی یہ پوزیشن ہو، دنیا میں کوئی متمدن انسان اس معاشرہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے؟

آپ کہیں گے کہ یہ جہالت ہے۔ ٹھیک ہے یہ جہالت ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس جہالت کی بنیاد کس تصور پر ہے؟ اس تصور پر کہ باپ کو حق حاصل ہے کہ اپنی بیٹی کا ہاتھ جس کے ہاتھ میں چاہے دیدے اور بیٹی کے مہر کا مالک اس کا باپ ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں ہمارے ہاں بطور مسئلہ مانی جاتی ہیں۔ حالانکہ دونوں قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہیں۔

یاد رکھئے جب تک ہمارے معاشرہ میں قرآنی تعلیم عام، اور قرآنی قوانین رائج نہیں ہوتے، معاشرہ کا جہنم جنت سے

نہیں بدلا جا سکتا۔

۳۔ **قرآن کے ترجمے** اکثر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کریم عربی زبان کی کتاب ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ مختلف ترجموں سے قرآن کا مختلف مفہوم سمجھ میں آتا ہے جس کی وجہ سے اس قدر اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنے والے، قرآن کا ترجمہ نہیں کرتے بلکہ قرآن کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس سے ان کے فرقے کے مسلک وعقائد کی تائید حاصل ہو جائے۔ اس کا تازہ ثبوت ملاحظہ فرمایئے۔ صدق (لکھنؤ) کے مدیر، عبدالماجد صاحب دریابادی نے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کا ماہنامہ برہان اپنی مئی ۱۹۵۸ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ

> انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت تھی جس کو اہلسنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق ومعارف پر صحت عقیدہ وخیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔ بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ترجمہ وتفسیر کی خصوصیت کیا بتائی گئی ہے؟ یہ کہ اس میں قرآنی حقائق کو اہل سنت والجماعت کے عقائد کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔

یہ چیز صرف زیر نظر ترجمہ وتفسیر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ قرآن کا ہر ترجمہ اور تفسیر اُس فرقہ کے عقائد کی تعبیر ہوگی جس سے وہ مترجم ومفسر متعلق ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کو اس انداز سے پیش کیا جائے گا تو قرآن اپنی حقیقی اور منزّہ شکل میں کبھی سامنے نہیں آسکے گا۔ قرآن کا صحیح مفہوم وہی سمجھ سکتا اور پیش کر سکتا ہے جو فرقوں سے بلند ہو کر صرف مسلم ہو جائے۔ فرقوں سے وابستگی اور قرآن، دو متضاد باتیں ہیں۔ اسی لئے تو قرآن نے فرقہ بندی کو شرک کہا ہے۔

درس قرآن تعمیر مکان کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ سے محترم پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس قرآن وسط جون سے شروع نہیں ہو سکا۔ امید کی جاتی ہے کہ اب یہ سلسلہ جولائی کے دوسرے ہفتہ میں شروع ہو جائے گا۔ اس کے متعلق لاہور کے اخبارات میں اعلان بھی شائع کیا جائے گا۔

درس 25/B گل برگ میں ہوگا

ہر اتوار کو صبح آٹھ بجے

مجلسِ اقبال

در معنیٰ ایں کہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است

"مذہب" اور "دین" میں فرق یہ ہے کہ مذہب میں زندگی انفرادی ہوتی ہے۔ وہ عبارت ہوتا ہے چند عقائد و رسومات سے جنھیں ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی انفرادی نجات کے لئے ادا کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں، افراد کی اجتماعی زندگی کے لئے کوئی اور وجہ جامعیت تلاش اور اختیار کرنی پڑتی ہے (مثلاً نسل۔ وطن وغیرہ کا اشتراک)۔ لیکن دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اس لئے اس میں افراد کی اجتماعی زندگی کے لئے کسی اور وجہ جامعیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین ہی وہ رشتہ ہوتا ہے جو ان منتشر اجزاء کو یکجا کرکے انھیں ملت یا اُمت بنا دیتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی آئین کی رُو سے متشکل ہوتی اور اس کے سہارے پر قائم رہتی ہے۔ اگر کسی قوم میں بے آئینی یا لاقانونیت پیدا ہوجائے تو وہ قوم، قوم نہیں رہتی۔ منتشر افراد کا گروہ بن جاتی ہے۔ اُمتِ محمدیہ کا آئین و دستور، قرآن کریم ہے جب تک اس کے افراد اس "حبل اللہ" سے متمسک رہیں گے، وہ اس اُمت کے اجزاء ہوں گے۔ جب یہ رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، وہ بھی منتشر افراد کا گروہ بن جائیں گے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ مختلف ممالک کے مسلمان ایک قوم بننے کے لئے وجوہ جامعیت تلاش کرتے ہیں (مثلاً عرب ممالک، نسلی اشتراک کی بنا پر اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا ہندوستان کے مسلمان وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے فرد بنتے ہیں)، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ہمارے ہاں "دین" کی جگہ مذہب آچکا ہے۔ اور

(۲) ہم نے مدت سے قرآن کے حبل المتین کو گم کر رکھا ہے۔

ملت کی شیرازہ بندی آئین سے ہوتی ہے۔ جب آئین ہی نہ رہے تو پھر اجتماعیت کہاں!

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست | مثلِ خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستیِ مسلم ز آئین است و بس | باطنِ دینِ نبی این است و بس

ملت کوئی بھی ہو، جب اس میں آئین کی وحدت نہ رہے تو اس کے افراد ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں۔ یہی اصول ملتِ اسلامیہ پر بھی منطبق ہوتا ہے اس کی ہستی بھی آئین ہی سے قائم ہے۔ یہی دینِ خداوندی کا راز ہے۔

برگ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد
گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

چھوٹی چھوٹی منتشر پتیوں کو رشتۂ آئین میں منسلک کر دیجیے تو وہ پھول بن جائیں گی۔ پھولوں کو آئین کے تلگے سے باندھ دیجیے تو ان کا نام گلدستہ ہو جائے گا۔

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے

آواز میں نظم و ضبط پیدا کر دیجیے وہ موسیقی بن جائے گی اُسے نظم و ضبط سے آزاد کر دیجیے، وہ شور و غوغا کہلائے گی

در گلوئے ما نفس موجِ ہوا ست
چوں ہوا پابندِ نے گردد نوا ست

سانس ہمارے گلے میں رہے تو اس کی حیثیت ہوا کی لہروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن وہی سانس جب بانسری میں پہنچ کر آئین کا پابند ہو جاتا ہے تو نغمۂ دل کش بن جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ کائنات میں منتشر اجزا نظم و ضبط اور آئین و دستور کی رُو سے ایک نئی جاذب صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس اصول کی تبئین و تشریح کے بعد علامہ اقبال مسلمان سے پوچھتے ہیں کہ

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست

کیا تجھے بھی علم ہے کہ تیرا آئین کونسا ہے؟ صفحۂ ارض پر تیرے تمکن کا راز کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وہ خود ہی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آئین۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم

خدائے زندہ و پائندہ کی وہ کتاب زندہ ہے جسے قرآن کہتے ہیں اور جس کی حکمت نہایت زمانی (و مکانی) نہیں رکھتی۔

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

اس میں زندگی کے قیام اور بقا کے راز پوشیدہ ہیں۔ جس قوم کے کہیں پاؤں نہ ٹکتے ہوں۔ جو دنیا میں بے حد کمزور و ناتواں ہو۔ وہ اگر اس سہارے کو تھام لے تو اسے ثبات و استحکام نصیب ہو جاتا ہے۔

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اس کے الفاظ کی صحت و صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ نہ ہی اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کی آیات ایسی واضح اور محکم ہیں کہ ان میں دور از کار تاویلات کی کہیں ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔

پختہ تر سودائے خام از زورِ او
در فتد با سنگ جام از زورِ او

اس کی تعلیم سے بے یقینی، یقین میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خام تمنائیں، زندگی کے مستحکم عزائم بن جاتی ہیں۔ انسانی ذات میں وہ پختگی آ جاتی ہے کہ وہ باطل کی ہر قوت کے ساتھ بلا تامل و توقف ٹکرا جاتی اور اسے پاش پاش کر دیتی ہے۔

می برد پابندۂ آزاد آورد
صید بنداں را بعشریلو آورد

دنیا بھر کی غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے جب اس کے حضور پہنچتے ہیں تو ان کی تمام زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور وہ آزادی کی فضائے بسیط میں اپنی انتہائی وسعت و کشادگی سے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

جب وہ آئے تھے تو وہ (قیدیوں کی طرح) رو رہے تھے اور ان کے مستبد آقا ہنس رہے تھے۔ لیکن قرآن کی بارگاہ میں پہنچنے کے بعد، وہ ہنس رہے ہیں اور ان کے قید کرنے والے رو رہے ہیں۔ قرآن ہر نوع غلامی کے لئے پیغام موت ہے۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمین

قرآن، خدا کی طرف سے نازل شدہ آخری ہدایت اور نوع انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کا بھیجنے والا رب العالمین ہے خود ذکرٌ للعالمین اور جس کی وساطت سے یہ نوع انسانی تک پہنچا وہ رحمۃ للعالمین یعنی عالمگیریت اس کے بنیادی خصائص میں سے ہے

اوج می گیرد از و ناارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

جس کی کوئی عزت و توقیر نہ ہو، وہ اس کا دامن تھامے تو اسے دنیا بھر کی سرفرازیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ یہ انسان کو ہر قسم کی محکومی سے آزادی دلا کر، شرف و مجد کی انتہائی سربلندیاں عطا کر دیتا ہے۔

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند
از کتابے صاحبِ دفتر شدند

جو لوگ ڈاکے ڈالتے اور رہزنی کرتے تھے، جب وہ اس کی تعلیم سے متاثر ہوئے تو کاروانِ انسانیت کی قیادت و امامت ان کے حصے میں آ گئی۔ جب انہوں نے اس کتاب کو نصاب زندگی بنایا تو وہ دنیا کی سلطنتوں کے مالک بن گئے۔

دشتِ بے پایاں ز تابِ یک چراغ
صد تجلی از علوم اندر دماغ

عربوں کی سی صحرا نورد اور جاہل قوم۔ جب انھوں نے قرآن کے جگمگاتے چراغ (سراجاً منیراً) سے روشنی حاصل کی تو ان کے دماغ دنیا بھر کے علوم و فنون کے طاق بن گئے۔

آنکہ دوشِ کوہ بارش بر نتافت　　　سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما　　　گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما

قرآن میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲) اس کا صحیح مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوانین الٰہیہ کی اطاعت کے فریضہ کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو انھوں نے اس کی ادائیگی میں قطعاً خیانت نہ کی۔ وہ اس خیانت کے نتائج و عواقب سے ڈر گئے۔ لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے وہ بڑا ہی سرکش اور بے وقوف ہے۔

لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت کو زمین اور آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا۔ وہ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس آیت کا یہی مفہوم لیا ہے اور بار امانت کی تلمیح سے کئی ایک مقامات پر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مندرجہ صدر اشعار میں بھی یہی کہا گیا ہے یعنی وہ قرآن جسے اٹھانے سے زمین و آسمان نے انکار کر دیا۔ وشت و جبل جس کے متحمل نہ ہو سکے۔ کس قدر مقامِ حیرت و مسرت ہے کہ وہی قرآن (جو ہماری تمناؤں کا محور اور ہماری امیدوں کا مرکز ہے) ہمارے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینوں میں سمایا ہوا ہے۔

جس تسلسل و ترنم سے یہ مضمون سامنے آ رہا ہے اس سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ علامہ اقبال کے سامنے جب قرآن کا ذکر آتا ہے تو وہ کس کیفیت و مستی میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی فکر میں کس قدر روانی اور ان کے قلم میں کیسی گلکاری آ جاتی ہے۔ وہ کس جذب و شوق اور ولولہ و جوش سے اس کی حمد و ستائش میں محو نشید ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں قرآن سے بے پناہ عشق تھا۔ اور یہی ان کا عشقِ قرآن ہے جس کی وجہ سے ہمارے دل میں ان کی عظمت و عقیدت ہے۔

قرآن کے سلسلہ میں اتنے اشعار آپ کے سامنے آ چکے ہیں لیکن ہنوز حضرت علامہ کے ذوق کی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ اور آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

آں جگر تابِ بیابانِ لم آب
چشمِ او احمر ز سوزِ آفتاب

وہ عرب جو اس بے آب و گیاہ صحرا کے وسعت ناآشنا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اور تمازتِ آفتاب سے اُن کی آنکھیں ہمیشہ سرخ

رہتی تھیں۔

خوشتر از آہوے رم جمازہ اش
گرم چو آتش درم جمازہ اش

ایک عرب اور اس کی ایک اونٹنی۔ ایسی اونٹنی جس کی رفتار ہرن سے بھی زیادہ خوش آئند۔ جس کی سانس زندگی کی حرارتوں کا پرکالہ۔ بس یہ تھی ان عربوں کی کائنات۔

رخت خواب افگندہ در زیر نخیل
صبحدم بیدار از بانگ رحیل

زندگی ان کی کیا تھی؛ ہر صبح سفر۔ ہر شام سفر۔ تھک گئے تو کھجور کے سائے تلے، ریت کے ٹیلے پر سو گئے۔ جب قافلے کی روانگی کا وقت آیا تو جاگ اٹھے۔

دشت سیر از بام و در نا آشنا
ہرزہ گرد از حضر نا آشنا

صحرا نوردی ان کا مسلک اور دشت پیمائی ان کا مشرب تھا۔ ان کی ساری عمر انہی ریگستانوں میں گذر جاتی۔ نہ کہیں گھر نہ بار۔ نہ بستی نہ قریہ۔

یہ تھی زندگی ان عربوں کی۔

تا دلش از گرمیٔ قرآں تپید
موج بیتابش چو گوہر آرمید

خواند ز آیاتِ مبینِ او سبق
بندہ آمد۔ خواجہ رفت از پیشِ حق

لیکن جب وہ قرآن سے آشنا ہوئے اور اس نے ان میں قلب ماہیت کر دی تو ان کی ساری (داخلی اور خارجی) زندگی بدل گئی۔ وہ اس کے سامنے آئے تو غلام تھے۔ گئے تو دنیا جہان کی سلطنتوں کے مالک

از جہانبانی نوازد ساز او
مسندِ جم گشت پا انداز او

ادھر قیصر کی سلطنت ان کے زیرِ نگیں۔ ادھر کسریٰ کا تخت ان کے پاؤں کے نیچے۔

شہرہا از گردِ پایش ریختند
صد چمن از یک گلش انگیختند

وہی عرب جنہیں کبھی مکان کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی تھی، اب ان کی حالت یہ تھی کہ جہاں وہ اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دیتے وہاں ایک عظیم الشان شہر آباد ہو جاتا۔ یہ جو دنیا میں، مختلف مقامات پر، تہذیب و تمدن کی گلکاریاں نظر آتی ہیں سب انہی کے دمِ سیراب کی ساختہ منت

ہیں۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ موجودہ مسلمان کی طرف آتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ

اے گرفتارِ رسومِ ایمانِ تو　　　شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
قطع کردی امرِ خود را در زبر　　　جادۂ پیمائی اِلیٰ شیئٍ نُکُر

تیرا ایمان۔ ایمان نہیں۔ چند بے روح رسوم کا مجموعہ ہے۔ تیری زندگی ایک آزاد مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ غیر قرآنی نظریات معتقدات، و تصورات کا جیل خانہ ہے جس میں تو تہدیوں کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ خدا نے ایک آئین (قرآن) کی وجہ جامعیت سے تمہیں اُمّتِ واحدہ بنایا تھا۔ تم فرقوں میں بٹ گئے اور اس طرح اس اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے (فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا۔ ۲۳/۵۳) اور ہلاکت و بربادی کے جہنم میں جا گرے۔ (يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ۵۴/۶)
تجھے اچھی طرح سُن رکھنا چاہیئے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بقرآں زیستن

اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو یہ چیز قرآن کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔ اس وقت جس مذہب کو تم نے اسلام کہہ کر اختیار کر رکھا ہے وہ یکسر غیر قرآنی عناصر کا مجموعہ ہے۔ تمہارے اربابِ طریقت ہوں یا اصحابِ شریعت۔ سب بتانِ عجم کے پجاری ہیں۔

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست　　　از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش　　　در نمی سازد بقرآں محفلش
از کلاہ و بوریا، تاج و سریر　　　فقرِ او از خانقاہاں باج گیر

صوفیوں کی یہ حالت ہے کہ " اللہ ھو " کی ضربیں ان کی عبادت اور قوالوں کی تانیں ان کی تلاوت ہے۔ ان کی محفلوں میں کبھی قرآن کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ سنائی دے گا تو بھی شعراء کا کلام اور ان کے افیون زدہ اشعار۔ "خلافت" کے یہ بھی ہیں لیکن کوئی خلافت کے، حضرت صدیقؓ و فاروقؓ کی خلافت کے نہیں۔ فقر کی خلافت کے، جس میں مانچھی ہوئی ٹوپی کو تاج اور بوریے کو تخت سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس میں بادشاہوں سے خراج نہیں لیا جاتا۔ خانقاہوں سے "فتوحات" اکٹھی کی جاتی ہیں۔

یہ ہے طریقت دوسری طرف شریعت کو دیکھئے تو

واعظِ دستاں زن افسانہ بند　　　معنیٔ او پست و حرفِ او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او　　　با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

ان ملاؤں نے دین کو چیستاں بنا رکھا ہے۔ ان کے وعظ سنئے تو وہ دنیا بھر کے افسانوں کا مجموعہ ہوں گے۔ خطابت کی طرف آئیے تو الفاظ بڑے پُرشکوہ لیکن معانی بہت پست۔ جب دیکھئے راویوں کی گفتگو ہے اور روایات کی بحثیں۔ فلاں نے یہ کہا اور فلاں کا یہ قول ہے۔ یہ روایت ضعیف ہے۔ وہ قوی ہے۔ قرآن ان کے ہاں مردوں کو ثواب پہنچانے کے کام آتا ہے اور بس۔

اس اسلام سے تمہارا کچھ نہیں بن سکتا۔ یاد رکھو

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

اصل دین، قرآن کے اندر ہے۔ اس کی تلاوت سے مراد الفاظ کا دہرانا نہیں۔ اس کا اتباع کرنا ہے۔ جب تم کہتے ہو کہ اس پر تمہارا ایمان ہے تو اس ایمان کا کچھ حق بھی ہے اور وہ حق یہ ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو۔ اسے زندگی کا نصب العین بناؤ۔ تم یہ کرو۔ اور اس کے بعد جو کچھ چاہو اس سے حاصل کرو۔ یہ سب کچھ دے گا۔

رابطۂ باہمی

(۱) ۸ جولائی کو جس غیر رسمی اجتماع کی تحریک کی گئی تھی اس میں شرکت کے لئے معدودے چند بزموں کی طرف سے آمادگی کے جواب موصول ہوئے ہیں۔ اندریں حالات اس اجتماع کو سردست ملتوی کیا جاتا ہے۔ آئندہ اجتماع کے متعلق بعد میں اعلان ہوگا۔

(۲) بزموں کی طرف سے ماہانہ روئیداد باقاعدہ موصول نہیں ہو رہی۔ متعلقہ بزمیں اس طرف خاص توجہ دیں۔ روئیداد ہر ماہ کی بیس تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ میں پہنچ جانی چاہیئے۔

(۳) اگر کسی بزم کا کوئی رکن کسی دوسرے شہر میں اراکین بزم سے ملنے کے لئے جائے تو وہ جس بزم کا ممبر ہے اس کے نمائندہ کو چاہیئے کہ دوسری بزم کے نمائندہ کو "تعارفی خط" بھیج دے۔ اس سے بہت سی شکایات رفع ہو جائیں گی۔

(۴) **نئی بزم** | منظور شدہ بزموں کی فہرست میں "بزم تحصیل جامپور ضلع ڈیرہ غازی خان" کا اضافہ کر لیں۔ حکیم خدا بخش صاحب بزم کے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔

اِسلام کی سرگذشت

(محترم ڈاکٹر احمد امین مصری)

[گذشتہ اقساط میں عہدِ بنی اُمیہ کی علمی حرکات بیان کی جا رہی تھیں۔ دینی علوم کی گرم بازاری کے بعد تاریخی حرکت کا بیان کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ غیر مسلم اقوام اس پر کس طرح اور کس کس نہج سے اثر انداز ہوئیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہودی، نصرانی اور ایرانی اقوام نے کیا کیا اثرات مرتب کئے۔ اس کے بعد اب یہ بتایا جائے گا کہ عہدِ بنی امیہ میں ممالکِ اسلامیہ کے کون کون سے شہر علمی مرکز کی حیثیت سے متعارف تھے اور کن کن شہروں میں کس کس قسم کے علوم و فنون کی گرم بازاری تھی۔]

فصلِ دُوم

حیاتِ عقلیہ کے مراکز

ہم دیکھتے ہیں کہ دین، فن، علم اور ادب ہمیشہ شہروں سے پھوٹتے اور وہیں پروان چڑھتے ہیں۔ یہی کچھ پہلے زمانہ میں ہوتا تھا۔ اور یہی کچھ آج ہوتا ہے۔ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ نئے نئے نظریات اور افکار ابتداءً شہروں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال علم و ادب اور فن کے مراکز کا ہے کہ مدرسے، یونیورسٹیاں، کالج لائبریریاں، کتابیں، اخبارات اور رسالے شہروں میں زیادہ اور بڑے ہوتے ہیں۔ دیہات میں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ اس کے چند اسباب ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

(۱) شہروں کی آبادی زیادہ اور ان میں تمدن و عمران کی کثرت ہوتی ہے۔ آبادی اور عمران کی کثرت چند اسباب کی ترقی

سے ہوتی ہے ۔ ان میں بعض اسباب کا تو اس کثرت سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جیسے مثلاً زمین کی سرسبزی، عمدگی اور پیداوار کی کثرت وغیرہ ۔ اور بعض اسباب کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا مگر بالواسطہ تعلق ہوتا ہے جیسے مثلاً شہری مصنوعات کا ان دوسری اقوام سے تبادلہ جن کی زمینیں سرسبز، اور پیداوار سے سرمایہ دار ہوں ۔ اس طرح جو آبادی کی کثرت ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں یہاں کے لوگوں کو ایک گونہ فراغ بالی نصیب ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کے باشندوں کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت ایسے کاموں پر بھی لگا سکیں جن کا تعلق ان کی کسب معاش سے نہ ہو ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی ترقی کے مواقع بھی میسر آتے رہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ آراء اور افکار کا تبادلہ دوسرے لوگوں سے کر سکتے اور زندگی پر بہ نسبت دوسرے لوگوں کے جو محض پیشہ یا افادہ مادی نظر ہی سے اس پر غور کر سکتے ہیں زیادہ بلند نگہی سے اس کا جائزہ لے سکتے ہیں ۔ اس طرح ان لوگوں میں رائے اور علم پیدا ہوتا ہے اور ادب ترقی کرتا ہے[۱۱]۔

مختلف شہر مختلف انواع و اقسام کے علوم میں ممتاز ہوتے ہیں ۔ ایک شہر کسی ایک علم میں ممتاز ہوتا ہے تو دوسرا شہر کسی دوسرے علم میں ۔ اور تیسرا شہر کسی خاص فن یا ادب میں ۔ چنانچہ مثال کے طور پر دیکھئے تو علم حدیث اور علم تاریخ اسلامی وہ علوم ہیں جو اس عہد میں حجاز میں بکثرت ملتے تھے جبکہ دینی مسالک و مذاہب نے زیادہ تر عراق میں نشو و نما پائی اور نحو نے بصرہ میں ترقی کی ۔ ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں ایسے اجتماعی اسباب موجود تھے جو اس پر منتج ہوئے ۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے خلاف ظہور پذیر ہو سکتا ۔ علمی شہرت اور کسی خاص علم کی نوع کے ساتھ کسی شہر کا امتیاز اور مختلف شہروں کا اس خصوصیت میں مختلف ہونا چند اسباب کی بناء پر ہوتا ہے ۔ اس زمانہ پر غور کرتے ہوئے جس سے ہم گفتگو کر رہے ہیں ان اسباب میں سے اہم ترین سبب یہ تھے ۔

(۱) اسلامی مدنیت ان پرانی اور قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات سے مرتب ہوئی ـــــ جو ان ممالک پر ایک خاص انداز سے چھائی ہوئی تھیں ۔ جیسا کہ ہم عراق اور شام کے شہروں میں دیکھ چکے ہیں ۔ مسلمانوں نے جب ان ممالک کو فتح کیا تو وہ شہر پرانی تہذیبوں کی چھاپ اور اپنی پرانی عقلیت سے بالکل خالی نہیں ہو گئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان تہذیبوں پر اسلام نے جدید اثرات ڈالے تھے ۔ لہذا اسلام کے بعد جو جدید عقلیت پیدا ہوئی وہ ایک ساتھ ان دونوں اثرات کا نتیجہ تھی ۔ پرانی تہذیب کا بھی اور اسلامی اثرات کا بھی ۔

---

[۱۱] اس پر اس کا اور اضافہ کر لیجئے جو ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ حضارت اور تمدن سے عقل بڑھتی ہے کیونکہ حضارت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں ۔ تدبیر منزل، معاشرت ابنائے جنس، علوم و آداب کی تحصیل، اس کے بعد امور دینیہ کا اہتمام اور دینی آداب و شرائط کا لحاظ ۔ یہ تمام چیزیں بذاتہ وہ قوانین ہیں جن سے علوم مستنبط ہو سکتے ہیں ۔ ان کا لحاظ کرنے اور پابندی کرنے سے عقلیت میں بلا سبالغہ اضافہ ہوتا ہی ہے ۔

(۲) صحابہ اور تابعین میں سے پُرانے علماء جن کی علمی شخصیتیں مختلف تھیں ـــ اس بات کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ـــ مختلف شہروں میں آکر بس گئے اور وہاں انھوں نے اپنے اپنے مزاج عقل کے مطابق مختلف مدرسے اور مختلف مناہج فکر قائم کئے۔ یہ شہر جن میں یہ حضرات آکر بسے تھے ان کی شخصیتوں سے متاثر ہوئے اور علمی میدان میں انہی کے طریقے پر چل نکلے۔

(۳) سیاسی اور غیر سیاسی حوادث کے ظہور کا بھی اس سے گہرا تعلق تھا کہ کچھ شہر خاص خاص علوم میں ممتاز اور الگ الگ انداز فکر میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں ظہور فرمانے اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے نے مکہ اور مدینہ کو ایک خاص علمی رنگ دے دیا تھا۔ بکثرت سیاسی حوادث کے ظہور اور ملاحم و فتن کے تسلسل نے عراق میں نئے نئے دینی مذاہب و مسالک کے نشو و نما میں بڑا حصہ لیا۔ بنو امیہ کی خلافت کا دمشق میں استقرار شام میں علمی زندگی کا ایک خاص رُخ متعین کرنے کا باعث ہوا۔ غرضیکہ ان حالات و واقعات نے مختلف شہروں میں مختلف اثرات مرتب کئے جن کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔

بہر حال اس دور میں اہم ترین عقلی مراکز حجاز میں مکہ اور مدینہ، عراق میں بصرہ اور کوفہ، شام میں دمشق، اور مصر میں فسطاط جیسے شہر تھے۔

حجاز

حجاز ایک بنجر ملک ہے جہاں نہروں کا نام و نشان نہیں۔ یہاں کی سرزمین زیادہ تر ریتیلے میدانوں یا پتھریلے ٹیلوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں گرمی اس شدت کی پڑتی ہے کہ زمین پر کچھ پیداوار نہیں ہو سکتی بجز ان چند وادیوں کے جو ادھر اُدھر منتشر اور بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ یہاں کے اکثر باشندے بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنے ارد گرد کی دُنیا سے کوئی خاص علاقہ اتصال بھی نہیں رکھتے بجز اس تھوڑے سے تعلق کے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان پر مختلف تہذیبوں اور مدنیتوں نے یکے بعد دیگرے کوئی اثرات نہیں ڈالے جن سے ان میں حضارت اور علم و فن پیدا ہو سکتے۔ متمدن دنیا سے ان تک بجز یہودیت اور نصرانیت کے کچھ اثرات کے یا غیر مانوس طریقے پر کچھ حکمت اور فلسفہ کے اور کچھ نہیں پہنچ سکا۔ اس کے باوجود کہ انھوں نے ان اقوام سے جنھوں نے ان پر حکومت کی جو کچھ علم یا مدنیت وراثت میں نہیں پائی۔ البتہ ان کی آزادی اور استقلال نے ان میں ایک قسم کا غرور، عزتِ نفس، خود اعتمادی اور آزادہ منشی ضرور پیدا کر دی تھی جو حد سے بڑھ گئی تھی۔ یہ چیز اتنی بڑھ چکی تھی کہ یوں کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ سب کے سب بیک وقت بادشاہ بننا چاہتے تھے۔

اسلام آیا تو حجاز کے ان دونوں شہروں ـــ یعنی مکہ اور مدینہ ـــ کی بڑی علمی شان تھی۔ لیکن یہ محض دینی علم تھا جس پر عربی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ مکہ تو اس لئے کہ وہ اسلام کا سرچشمہ تھا اور وہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور نشو و نما ہوئی تھی اور وہیں وہ ابتدائی واقعات پیش آئے تھے جو قریش کو اسلام کی دعوت دینے اور اس دعوت کا مقابلہ کرنے میں ظہور پذیر ہوئے۔ مکہ ہی سے ان تشریعی مسائل کا تعلق ہے جو وہاں مقرر ہوئے۔ ان کو کما حقہٗ سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان احوال و ظروف کو نہ سمجھا جائے جو مکہ میں وہاں کے لوگوں پر حاوی تھے۔ ان اسلامی تشریعات میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جن میں وہ اصل اور مناسک و رسوم کو برقرار رکھا گیا ہے جو مکہ میں اسلام سے پہلے رائج تھیں، جیسے اکثر حج کے مناسک وغیرہ۔

رہ گیا مدینہ منورہ تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت گاہ تھی۔ اکثر اسلامی تشریعات وہیں ظہور پذیر ہوئیں۔ مدینہ منورہ صدر اسلام کے اکثر تاریخی حوادث کا سرچشمہ تھا۔ وہیں رسول اکرم صلعم نے اپنے ارشادات و اقوال ارشاد فرمائے۔ ان کو بھی پوری طرح سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مدینہ منورہ کے ان احوال و ظروف کو نہ سمجھا جائے جو اس زمانہ میں اس شہر پر اثر انداز ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ اسلامی عہد کے اہم ترین عہد یعنی ابوبکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ اور عثمان بن عفانؓ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مرکز خلافت رہا تھا۔ یہاں اکابر صحابہ میں سے بیشتر وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے رسول اکرم صلعم کو عمل کرتے دیکھا اور ارشاد فرماتے سنا تھا بلکہ ان حادثات و وقائع میں وہ شریک رہے تھے جن سے متعلق باتیں وہ نقل کرتے تھے۔ مثلاً مختلف غزوات اور فتوحات۔ لہذا جو کچھ انھوں نے سنا اور دیکھا تھا وہ اسے بیان کرتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عہد میں مکہ اور مدینہ حیاتِ علمی کے اہم ترین مراکز تھے حدیث، فقہ اور تاریخ کے طلباء ان دونوں شہروں کی طرف آتے تھے اور علم حاصل کرتے تھے۔ اس ضمن میں مدینہ منورہ کی شان بہ نسبت مکہ معظمہ کے بڑھی ہوئی تھی۔ کیونکہ مکہ مکرمہ کا جو مشہور آدمی مسلمان ہوا وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرکے چلا گیا۔ ہجرت کے بعد بھی جو مکہ والے مسلمان ہوتے تھے وہ بھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جاتے تھے خصوصیت کے ساتھ جبکہ ان کا شمار قریش کے سربرآوردہ اور ہوشمند لوگوں میں ہوتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ مدینہ منورہ کی طرف تمام جزیرۂ عرب کے باشندوں میں سے منتخب شخصیتیں جو اسلام لانا چاہتی تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منورہ ہی کی طرف کھنچی ہوئی چلی آتی تھیں۔ بیشتر حالات میں ان کی دینی غیرت انھیں مجبور کرتی تھی کہ وہ رسول اکرم صلعم کے ساتھ آپ کے قریب ہی بس جائیں۔ آپ سے علم حاصل کریں، آپ کے ساتھ عبادت کریں، آپ کے ارشادات سنیں اور آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوں۔ رسول اکرم صلعم کی وفات کے بعد مدینہ منورہ ہی مستقر خلافت اور اکابر صحابہ کا مرکز بنا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے اکابر قریش کو سختی کے ساتھ منع فرمادیا تھا کہ وہ بلا ضرورت شدیدہ مدینہ منورہ سے باہر نہ جائیں۔ بڑی بڑی فتوحات کے زمانہ میں اسیرانِ جنگ یہاں ہی لائے جاتے تھے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس کی ممانعت فرمادی تھی کہ جنگ کے مقامات پر اسیرانِ جنگ کو تقسیم نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ تمام قیدی ابتداءً مدینہ منورہ ہی لائے جاتے تھے۔ ان جنگی قیدیوں میں زیادہ تر ایران اور روم کے لوگ ہوتے تھے جو اپنی قوم میں اونچے طبقہ (ارستقراطیہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اسی طریقہ پر علم حاصل کرتے تھے جو ان کی قوم اور ان کے زمانہ میں رائج تھا۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ مدینہ منورہ میں رہ گئے۔ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں ان میں سے بہت سے لوگوں کا نام شمار کرایا ہے۔ یہ سب کبار صحابہ کے آزاد کردہ غلام تھے جو ان کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے حیاتِ اسلامی کو اپنی اس عقلیت کے رنگ میں ——— جو بعض وجوہ سے ——— عرب کی عقلیت کے خلاف تھی رنگ دیا۔ یہ لوگ اپنی قوم میں منظم علم اور مدون کتابوں سے مانوس چلے آرہے تھے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی انھوں نے اس راہ کی پیروی کی۔ ان تمام باتوں نے مل کر علمی نقطۂ نظر سے مدینہ منورہ کا پایہ مکہ معظمہ پر بلند کر دیا تھا۔ اس پر اتنا اضافہ اور

کر لیجئے کہ مہاجرین، ابتدائے عہد اسلام میں اسے ــ دینی طور پر ــ پسند نہیں کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے پھر مکۂ معظمہ میں آکر آباد ہو جائیں۔ ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ محمد بن عمر نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ان مہاجرین میں سے جو جنگ بدر میں شریک تھے کوئی ایسا صحابی معلوم نہیں جو مکہ معظمہ میں واپس آیا ہو ــ یعنی نبی اکرم صلعم کی وفات کے بعد ــ اور وہاں آکر آباد ہو گیا ہو، بجز ایک ابو سبرہ کے جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد مکۂ مکرمہ لوٹ آئے اور وہیں رہنے لگے تھے۔ مسلمانوں نے ان کی اس بات کو پسند نہیں کیا۔ ابو سبرہ کی اولاد اس واقعہ کا انکار کرتی ہے اور وہ سختی سے اس کی تردید کرتے ہیں کہ ان کے والد مکہ مکرمہ آکر آباد ہو گئے ہوں جبکہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے جا چکے تھے۔ ابو سبرہ کی اولاد کے سامنے اس واقعہ کا ذکر بھی کر دیا جائے تو ان لوگوں کو اس پر غصہ آجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ کا مدرسہ علم کی کثرت اور دور دراز شہرت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس زمانہ کے اکثر علمائے تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں یہیں تحصیل علم عطا فرمائی۔ یہاں کے علماء سے علم حاصل کرنے کے لئے دور دور سے طالبانِ علم آتے تھے۔ چنانچہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے اپنے بیٹے "عمر" کو علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ منورہ بھیجا اور صالح بن کیسان کو لکھا کہ وہ ان کا خیال اور نگرانی رکھیں۔ ایک روز عمر کو نماز کے لئے آنے میں دیر ہو گئی۔ تو صالح بن کیسان نے عمر سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو عمر نے جواب دیا کہ میری مشاطہ میرے بال درست کر رہی تھی چنانچہ صالح نے یہ واقعہ ان کے باپ کو لکھ دیا۔ عبدالعزیز ابن مروان نے شام سے اسی وقت ایک آدمی بھیجا جس نے اس وقت تک عمر بن عبدالعزیز کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک انہوں نے اپنے بال نہ کٹوا دیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد ابن اسحٰق اور واقدی دونوں نے مدینہ منورہ کے مدرسہ ہی میں نشوونما پائی۔ چنانچہ تمام ان لوگوں کا اعتماد جنہوں نے مغازی اور سیرت کے موضوع پر کچھ بھی لکھا ہے انہی دونوں حضرات پر ہے۔ یہ بھی امر تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے اقوال و اعمال کو زیادہ یاد رکھنے والا، آپ کے غزوات سے زیادہ واقف اور آپ کی اور آپ کے خلفاء کی زندگی سے زیادہ خبردار مدینہ والوں سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی نگاہوں کے سامنے اور ان کے کانوں کے درمیان یہ تمام واقعات پیش آئے تھے۔ اب ہم مکہ کے مدرسہ اور مدینہ کے مدرسہ کے کچھ حالات اور وہاں کے مشہور علماء کا ذکر کرتے ہیں۔ (میثاق۔ آئندہ)

ٹیلیفون نمبر
ادارۂ طلوع اسلام ڈاکٹر آنک ریسرچ سینٹر کا ٹیلیفون نمبر
7500
ہے۔ احباب نوٹ فرمالیں۔

نقد و نظر

پیارے نبی کی پیاری زبان شائع کردہ: انجمن ترقی عربی پاکستان، سمن آباد، لاہور

از عبدالرحمٰن طاہر سورتی۔

قرآن مجید اپنے الفاظ و معانی میں غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے، اور اس راہ میں سب سے پہلی اور بنیادی چیز عربی زبان سے واقفیت ہے، ہمارے ملک کے مسلمانوں کے لئے قرآن فہمی کی راہ میں ایک بڑا حجاب خود عربی زبان ہے۔

انجمن ترقی عربی پاکستان، نے عربی زبان سیکھنے میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ایک پروگرام اپنے سامنے رکھا ہے جس کے ذریعے عام مسلمان، بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ فرصت کے مختصر لمحات میں تھوڑی محنت کے بعد عربی کی متوسط استعداد پیدا کر کے زبانِ قرآن کو سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

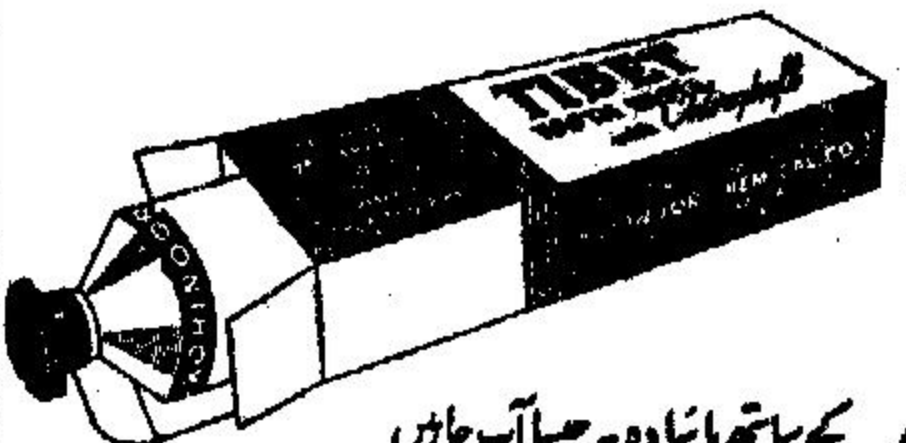

"پیارے نبی کی پیاری زبان" کے نام سے انجمن نے اب تک پانچ کتابچے شائع کئے ہیں۔ کل ۲۴ حصے شائع کرنے کا عزم رکھتی ہے جو دو سال کا مکمل کورس ہوگا، روزانہ دس پندرہ منٹ کی محنت سے ایک مہینہ میں بآسانی ایک حصہ ختم کیا

جا سکتا ہے۔ ان کتابچوں میں زبان سکھانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں نہ گردانوں کی رٹائی کی چکی پیسنی پڑتی ہے اور نہ تعلیلات کے بھنور میں چکر لگائے جاتے ہیں۔ طالب علم ہر قاعدے کو سمجھ کر ساتھ ساتھ چلتا جائے تو وہ گرامر کی دشوار گزار منزلیں آسانی سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔ انجمن کا دعوے ہے کہ اس طرح طالب علم آخری حصہ تک پہنچتے پہنچتے اس قابل ہو جائیگا کہ خود اعتمادی کے ساتھ عربی کتابوں کا مطالعہ کر سکے اور اپنی لسانی مشکلات عربی ڈکشنری سے حل کر سکے۔

اس طریقہ میں اردو زبان جاننے والوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان تمام الفاظ سے عربی سکھانے میں مدد لی گئی ہے جنہیں ایک اردو جاننے والا اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتا اور اخباروں میں پڑھتا رہتا ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ عربی زبان سکھانے کے لئے یہ سلسلہ مفید رہے گا۔ اس باب میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ مثالیں قرآن کریم سے دی جائیں۔ ہر حصہ کی قیمت آٹھ آنے ہے۔

قرآنی فکر کو اُجاگر کرنے والی کتابیں

مصنّفہ علامہ پرویز

سلیم کے نام خطوط

صفحات ۴۰۰ تقطیع درمیانہ (۲۰×۳۰/۱۶) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

اسلام کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اُن کا مدلل جواب کیس خطوں میں۔ زبان سادہ شگفتہ اور دل نشین۔

ہماری نمازیں۔ روزے۔ اجتماعات۔ شادیاں۔ تہذیب وغیرہ۔ طلاق کا قرآنی مفہوم۔ نظام ربوبیت کیمونزم اور اسلام۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ۔ مقام نبوت و رسالت۔ انسانی فطرت کچھ نہیں۔ انسانی صلاحیتیں اور اخلاق۔ خدا کا تصور۔ آزادی کا صحیح مفہوم۔

فردوس گم گشتہ

صفحات ۲۱۶۔ تقطیع درمیانہ (۲۰×۳۰/۱۶) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۴/- چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

پرویز صاحب کے نفیس مضامین کا مجموعہ جو زندگی کے اہم حقائق پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ایمان و عمل عقائد۔ مسلمان کی زندگی۔ عبادت۔ نجات۔ ثواب۔ زکوٰۃ۔ نیز عید الضحیٰ۔ عید الفطر۔ لیلۃ القدر اور معراج کی وضاحت۔

اسباب زوال اُمّت

صفحات ۱۷۶۔ تقطیع چھوٹی (۲۰×۳۰/۳۲) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

آدم جنت میں تھا۔ ابلیس کا فریب کھا کر جنت سے نکالا گیا۔ کیا وہ ——— دوبارہ جنت میں جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہاں ——— اسلام دین یعنی نظام زندگی ہے۔ مذہب رسومات کے مجموعہ کا نام ہے۔ دین کو مذہب بنا دینا باعث زوال اُمّت ہے۔ اُمّت کا عروج موجودہ مذہب کی جگہ دین کے قیام سے ہو سکتا ہے۔

اسباب زوال اُمّت کا یہ تجزیہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔

اس پتہ سے منگوائیے

ناظم ادارہ طلوع اسلام 25/B گلبرگ کالونی۔ لاہور

انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

96000

- اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ
- مرغا چھاپ سفید شرٹنگ
- دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ وغیرہ

میسرز علی محمد اسمٰعیل 39A/S مولجی جیٹھا مارکیٹ۔ کراچی

نیز

اسٹال:- مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ۔ پرانی نمائش
بندر روڈ ایکس ٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے!

داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ۔ کراچی